اخلاق محمد ﷺ

قرآن حکیم کے آئینے میں

﴿۵﴾

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

مدنی معاشرے میں ہر طرف رسول اللہ ﷺ کا نقش قدم

دنیا کے کم و بیش سارے قائد، رہنما اور اربابِ سیاست لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے ہیں، کیونکہ زیادہ قربت سے ان کی شخصیت کے خدوخال ان کے ماننے والوں کے سامنے آجائیں گے، اور جو رہنما لوگوں سے زیادہ میل جول رکھتے ہیں وہ بھی اپنے اتباع کرنے والوں سے اپنے ہی بنائے ہوئے ماحول میں ملنا پسند کرتے ہیں۔ اپنے آشرم میں، اپنی کٹیا میں، اپنے حجرے میں۔ یوں وہ ایسی ''مقدس'' یا ایسی ''مصنوعی'' فضا تیار کرتے ہیں جو ارادت مندوں کی عقیدت میں اور اضافہ کرے۔ اس اعتبار سے انسانی تاریخ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال پیش نہیں کرسکتی کہ ایک بے بس اور بے سہارا بڑھیا بھی اپنے کام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے جاسکتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر اپنے اصحاب کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور ان کے درد، دکھ میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے گھروں میں استراحت فرماتے اور ان کے گھروں کو بابرکت بنانے کے لئے ان میں نماز ادا فرماتے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی نظر میں رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کو اپنے نفوس سے بھی عزیز تر اور قریب تھے۔ جماعتِ مومنین آپ کے ابدی پیغام یعنی وحیٔ الٰہی اور قرآنِ حکیم اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے وجود میں آئی تھی۔ اسی لئے ضروری تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے تمام پہلو، تمام کیفیات، مختلف واقعات پر آپ کا ردعمل، آپ کی معاشی، اخلاقی اور تبلیغی جدوجہد، آپ کا طرزِ استراحت غرض کہ ہر چیز امت کے سامنے ہو کہ یہی وہ بہترین نمونہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بلکہ پوری انسانیت کو عطا فرمایا۔ اپنی امت کے غریب ترین فرد کا پاسِ خاطر آپ کو عزیز تھا۔ آپ کسی ہدیے کو قیمت کی میزان میں نہیں تولتے تھے بلکہ اخلاصِ قلب کا احترام فرماتے۔ آپ نے فرمایا کہ

اگر مجھے بکری کا ایک کھر (کراع) بھی ہدیتاً پیش کیا جائے تو میں اسے قبول کرلوں گا۔ کوئی صحابی اگر بیمار ہوتا تو عیادت کے لئے آپ کسی سواری کا انتظار نہ فرماتے بلکہ پاپیادہ تشریف لے جاتے۔

مدینۂ منورہ کے اسلامی معاشرے کے اُفق پر ہر طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا سورج چمکتا نظر آتا ہے۔ صحابۂ کرام سے اس قربت کے بغیر اسلامی طرزِ حیات کا صحیح تصور اور اندازہ قائم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آپ کی راتیں عبادت میں گزرتیں، تہجد آپ پر فرض تھا، نفلی نمازوں کی ایک رکعت میں آپ طویل ترین سورۃ کی تلاوت فرماتے۔ آپ کا ساتھ دینے کے لئے جو صحابہ شریکِ نماز ہوتے انہیں اپنی نماز مختصر کرنی پڑتی۔

زندگی کی ہمہ گیری کو دیکھئے اور پھر اس حقیقت کو کہ اللہ کا عظیم ترین رسول ہر جگہ ہماری پیشوائی کرتا نظر آتا ہے اور آج بھی آپ کی عملی قیادت ہماری راہیں ہموار کرتی نظر آتی ہے۔ اس ہمہ گیری کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ اسلام میں ثنویت (dualism) کا تصور نہیں۔ یہاں دین دنیا سے اور دنیا دین سے الگ نہیں۔ یہاں اس اندازِ فکر کی گنجائش نہیں کہ قیصر کا حق قیصر کو دیدو اور خدا کا حق خدا کو۔ حضرت زید بن ثابت کے پاس مسلمانوں کی ایک جماعت آئی تو اس نے فرمائش کی کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ بتایئے۔ حضرت زید نے جواب میں فرمایا کہ ''ماذا أحدثکم''۔ میں کیا کیا بتاؤں۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ قرآن آپ کا اخلاق تھا۔ حضرت زید سے سوال کرنے والے آپ کے مشاغل اور دلچسپیوں کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتے تھے، اس لئے حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''میں کیا کیا بتاؤں۔ میں آپ کا پڑوسی تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو مجھے بلا بھیجتے اور میں وہ وحی لکھ دیتا تھا۔ جب ہم دنیا کی باتیں کرتے تو آپ بھی (ہمارے ساتھ) دنیا کی باتیں کرتے۔ جب ہم آخرت کی باتیں کرتے تو آپ بھی آخرت کے ذکر سے ہمیں سرفراز فرماتے۔ جب ہم کھانے کی باتیں کرتے تو آپ بھی کھانے کی باتیں کرتے۔ تو میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیا باتیں کروں''۔ حضرت زید بن ثابت کے اس بیان میں کیسے کیسے نکات آگئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سے ان کی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو فرماتے اور ان مجالس میں انسانی زندگی اور اخلاق کے ہر پہلو پر اسلامی نصب العین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامعین کے سامنے آجاتا۔

مسجد نبوی میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری محفلوں اور مجمعِ صحابۂ کرام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص کی باتیں توجہ سے سنتے اور ہر شخص یہ سمجھتا کہ آپ کی نظرِ التفات اور توجہ خاص اس کی طرف

ہے۔ ہر انسان کی تالیفِ قلب آپ کو عزیز تھی۔ آپ کا یہ کرم صرف توجہ اور گفتگو تک محدود نہ تھا بلکہ آپ کے رویے میں حد درجے نرمی، شفقت اور محبت تھی۔ آپ کی رحمۃ للعالمینی کا یہ سماجی پہلو تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نرمی، عفو و درگزر کا ایک مستقل باب تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ دس برس آپ کے خادمِ خاص رہے اور اس طویل عرصے میں آپ نے انہیں سرزنش نہیں کی، نہ ہی خفگی کا اظہار فرمایا۔ مکی زندگی میں آپ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی شائستگی، نرمی اور درگزر کا معاملہ فرمایا، اور اس طرح کہ فریضۂ تبلیغ سے ایک لمحے کے لئے غافل نہیں ہوئے۔ یہ انسانی زندگی کی معراج اور اخلاقِ انسانی کا کمال ہے کہ زندگی کی تقویم ایک لحظے کی غفلت سے بھی محفوظ رہے۔

ہجرت کے بعد یثرب کو مدینۃ النبی بنانا ایک مسلسل عمل تھا۔ معاہدے، مواخاۃ، غزوات کا مسلسل سلسلہ، صلحِ حدیبیہ، فتح خیبر اور اسی کے ساتھ ساتھ ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجروں میں مسلسل رشد و ہدایات کا اجرا، انسانی رشتوں کے مفاہیم سے ازواجِ مطہرات، رشتہ دار خواتین اور صحابیات کو آگاہ فرمانا۔ قریش سے صلح حدیبیہ اور یہودیوں کی شکست کے بعد بھی غزوات اور عسکری مہمات کا سلسلہ جاری رہا۔ غزوۂ وادی القریٰ، غزوۂ ذات الرقاع اور ۷ھ میں کئی سرایا اور عسکری مہمات اور انہیں مصروفیات کے ساتھ ساتھ عمرۃ قضا۔ صلح حدیبیہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خواب میں اپنے آپ کو اور اپنے صحابہ کو طواف کرتے دیکھا تھا۔ نبی کا خواب بھی نبوت کا حصہ ہوتا ہے۔ صداقت ہی صداقت۔ ذی قعدہ کے مہینے میں آپ نے اس خواب کی تعبیر کے طور پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ عمرے کے لئے تیاریاں کریں۔ لیکن کفار نے آپ کو حدیبیہ سے آگے نہ جانے دیا، پھر اگلے سال ذی قعدہ ۷ھ میں آپ نے حکم دیا کہ حدیبیہ میں شریک ہر صحابی عمرۃ قضا ادا کرے۔ جب کاروانِ رسالت عمرے کے لئے مدینۂ منورہ سے نکلا تو اصحابِ حدیبیہ کے علاوہ اور کچھ اصحاب بھی اس سفرِ سعادت میں ہم رکاب ہو گئے۔ خواتینِ اسلام کی دل دہی اور معاشرے میں ان کے صحیح مقام اور اہمیت کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اہمیت دی۔ مسلمان خواتین تو غزوات میں بھی شامل رہیں اور ان فرائض میں مصروف جو عورت ہی بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے۔ آج ہمارے عہدِ انتشار کے معاشرے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا کہ آقائے نام دار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسلمان عورت کو کیا رتبہ اور معاشرتی اہمیت عطا فرمائی۔ آج افراط و تفریط میں گھرا ہوا مسلمان اور انسان اس معاشرتی اعتدال کو سمجھنے سے قاصر ہے جسے مکارم اخلاق کی تکمیل کرنے والے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے میں ممکن بنایا۔ عمرۃ القضا میں دو ہزار صحابیوں کے ساتھ صحابیات اور مسلمان بچے بھی شامل تھے۔ بچے، خواتین، نوعمر افراد،

جوان، ادھیڑ عمر اور ضعیف صحابہ۔ اس مسلسل انسانی زنجیر نے نسلی خلا (Generation gap) کے اندیشوں سے مدنی معاشرے کو محفوظ رکھا۔ نسلی خلا کا مسئلہ آج ہمارے لئے بڑا اخلاقی مسئلہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر عمر کے شہریوں کی ترجیحات مختلف ہیں اور ان میں کوئی ذہنی اور فکری رابطہ نہیں ہے۔ مختلف عمروں کے افراد کی سرگرمیوں میں فرق ضرور ہوگا لیکن اگر اسلام کے اخلاقی اور معاشرتی رابطے قائم ہوں اور اسوۂ حسنہ نظر کے سامنے ہو تو پورے معاشرے میں فکری اور ذہنی ہم آہنگی ہوگی۔

مدینے سے نکل کر ذوالحلیفہ کے مقام پر عمرے کا احرام باندھا گیا اور فضا **لبیك اللھم لبیك** کی صدا سے گونج اٹھی۔ آج بھی مدینۂ منورہ سے عمرے کے لئے روانہ ہونے والے افراد اور گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی اس صدا کو سن سکتے ہیں۔ شرط صرف تعلق بالرسول کی ہے۔ یہ تعلق جو صدیوں کو ہم رشتہ کر دیتا ہے اور ہمیں اس کاروانِ سعادت کا راہی بنا دیتا ہے۔

احتیاط، حفاظتی تدبیر اور دشمن کی فطرت سے باخبری بھی انسانی وجود اور اخلاق کے دائرے میں شامل ہے۔ قریش کی بدعہدی اور اچانک حملے اور مزاحمت کے خیال سے ہتھیار ساتھ لے لئے گئے اور جب یہ قافلۂ سعادت وادیٔ یاجج میں پہنچا تو سارے ہتھیار دو سو صحابہ کی نگرانی میں وہاں رکھ دیئے۔ ان محافظوں کی تعداد کے پیش نظر اہلِ مکہ کسی یورش اور کسی حملے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتے تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہیوں کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئے۔ اب صحابۂ کرام کی تلواریں معاہدے کے مطابق نیام میں تھیں اور لبیک کی صدائیں ان کے لبوں سے نکل کر فضا میں ایک جوئے نور کی طرح دائرے بناتی ہوئی رواں تھیں۔ مسلمانوں کے صاحب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وہ خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے پہلے تین چکر دوڑ کر لگائیں۔ یہ اس نبی کا حکم تھا جس نے ہمیشہ اپنے اصحاب کو یہی حکم دیا تھا کہ زمین پر چلتے ہوئے آہستہ روی اور تواضع کا خیال رکھیں۔ آپ نے یہ حکم اس لئے دیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اہلِ مکہ کو باور کرایا تھا کہ ''یثرب'' کے موسم، وہاں کے بخار اور آب وہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا تھا۔ کفر اپنے آپ کو کس کس طرح سے خود فریبی میں مبتلا کرتا ہے، حالانکہ اہل قریش کئی مرتبہ میدانِ کارزار میں مسلمانوں کی قوت دیکھ چکے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے لئے مشرکینِ مکہ نے مسجدِ حرام کے باہر قطار بندی کر رکھی تھی۔ وہ اپنے تجسس کو چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے اور اس وقت یہ بات ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ بہت جلد یوں ہی خانہ کعبہ میں آپ کے حضور کھڑے ہو کر عافیت طلبی کر رہے ہوں گے۔ جب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے تو ان کے آگے آگے حضرت عبداللہ بن رواحہ

رجزیہ انداز میں شعر خوانی کر رہے تھے۔ ان اشعار میں اسلام کی قوت کا ذکر تو تھا اور کافروں کے لئے تنذیر بھی تھی لیکن مفاخرت کا وہ انداز اور اپنی برتری کے اظہار کا وہ اسلوب نہ تھا جو عرب شاعری کا چلن تھا۔ ابن رواحہ کے بول کفار کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو رہے تھے۔

خلوا بنی الکفار عن سبیلہٖ

خلوا فکل خیر فی رسولہٖ

اے کفر زادو! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا راستہ چھوڑ دو، ہٹو، راستہ چھوڑو، کہ ساری بھلائی اور سارا خیر اللہ کے رسول میں ہے۔

حضرت عمر جیسے جری شیر پر حرمِ کعبہ کی عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام اس درجے طاری تھا کہ انہوں نے ابن رواحہؓ سے کہا کہ تم اللہ کے رسول اور خدا کے گھر کے سامنے شعر پڑھ رہے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ عمر! ان کو نہ ٹوکو۔ یہ اشعار کفار کے دل کے لئے تیر سے زیادہ کاری ہیں۔

یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا وہ اخلاق پوری قوت کے ساتھ سامنے آ گیا جو آپ کی تعلیمات کی پیروی اور وحیٔ الٰہی کے اتباع نے ان میں پیدا کیا تھا اور جس کا ذکر عمرۃ القضا سے پہلے ہی صلح حدیبیہ کے موقع پر سورۃ فتح میں ہو چکا تھا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۱)

اس آیت کو صلح حدیبیہ کے سیاق و سباق میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام پر اس کے اثرات کے سلسلے میں ان آیات میں جو نکات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے اہم ترنکات یہ ہیں:

۱۔ محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی (الذین معہ) ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں۔

۲۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاقی صفات ان کے اصحاب میں پوری طرح موجود ہیں۔ سابقون الاولون میں یہ اخلاقی رنگ زیادہ گہرا ہے۔ اس کا تعلق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی معیت کی مدت سے ہے۔ جو زیادہ عرصے آپ کے ساتھ رہا اس کے کردار اور ذات میں

اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتو اسی قدر زیادہ روشن ہے۔

۳۔ان اخلاقی صفات میں دو اجتماعی طور پر زیادہ اہم ہیں۔ایک تو کفر کے مقابلے میں ان کی شدت اور دوسرے آپس میں ان کی قربت، اخوت اور حم دلی جس سے معاشرے کی تعمیر ہوتی ہے۔کفر کے مقابل شدت سے وہ راز آشکار ہوتا ہے جو لا الہ الا اللہ میں مضمر ہے۔کفر کیا ہے؟ معبودانِ باطل کے سامنے سر جھکانا۔اور ان معبودوں کی نفی کے بغیر آدمی معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں نہیں پہنچ سکتا۔اللہ تعالیٰ کو پالینے والے افراد، ایک معاشرے میں داخل ہو کر اجتماعی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ مدینے کی شہری ریاست کا معاشرہ اس کا ثبوت ہے۔

۴۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا ایک پہلو عبادات ہیں۔عقائد و عبادات، اخلاقی صفات (اخوت، ہمدردی وغیرہ) اور معاملات یہ ایک دوسرے کے تار و پود کا درجہ رکھتے ہیں۔رکوع و سجود کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول ہے اور اعلیٰ ترین اخلاقی صفات کے پیدا ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو گیا ہے، یوں افراد کی تعمیر، معاشرے کی تعمیر کی بنیاد بن جاتی ہے۔

اس نکتے کو سمجھے بغیر ہم اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست قائم نہیں کر سکتے۔اللہ کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے، احادیث کی صورت میں اسلامی معاشرے کے خدوخال کی تفصیلات بھی ہمارے سامنے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور اسوۂ حسنہ کو اپنائے بغیر منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔نعروں اور جدید سیاست کے حربوں سے اسلامی معاشرے کا قیام اور افراد و اجتماعی زندگی میں اسلامی اخلاق کا نفوذ ممکن نہیں۔

جنگ موتہ، فوق البشر عسکری معرکہ

ارنبوی سے صحابۂ کرام کی اخلاقی تربیت اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نقشے کے مطابق شروع ہو گئی تھی۔ظلم کا مقابلہ صبر کے ہتھیار سے، گالیوں کا مقابلہ سلامتی کی دعاؤں سے، تمسخر کا مقابلہ متانت اور وقار سے۔وہ جو مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے آیا تھا جو انسانی نفوس کو بدل رہا تھا، اس کی تعلیمات ایسی قوتِ محرکہ تھیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ساتھی، انسانی تاریخ کا ایک عجوبہ اور معجزہ بن گئی۔جبلت کی یہ تسخیر نہ تو اس سے پہلے کبھی دیکھی گئی تھی اور نہ اس کے بعد۔آج بھی نفسِ انسانی میں یہ تغیر کبھی رونما ہوتا ہے تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے۔

جنگِ موتہ کا سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کی

شہادت تھا۔ ایلچی کو قتل کرنا اس عہد میں بھی ایک شدید جرم تھا اور رسولِ رحمت جو رسولِ ملحمہ بھی تھا اس نے اس جرم کی سزا دینے کے لئے تین ہزار کا لشکر مرتب فرمایا جو جمادی الاول ۸ھ میں اس علاقے کی طرف روانہ کیا گیا اور اسی شام میں بلقا کے قریب موتہ کے مقام پر یہ معرکہ پیش آیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس معرکے کی کئی باتوں سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اور ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ کو لشکر کا امیر مقرر فرمایا، اور ان کی شہادت کی صورت میں لشکرِ اسلام کو اجازت دی کہ جسے چاہیں سالار مقرر کر لیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلام کو یہ ہدایت فرمائی کہ جس مقام پر حضرت حارث بن عمیر شہید کئے گئے تھے اس مقام پر پہنچ کر وہاں کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کرنا۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو یہ تمہارے لئے اللہ کا انعام ہوگا اور بہ صورتِ دیگر اللہ کے راستے میں ان سے جہاد کرنا۔

جنگ ہر دور میں انسانوں کے لئے بڑی آزمائش رہی ہے۔ بادشاہوں نے اپنی ہوسِ ملک گیری میں انسانی بستیوں کو مقتل بنا دیا اور یوں تاراج کیا کہ وہ کھنڈر بن گئیں۔ لوگوں کی زندگی، عزت و ناموس سب غارت ہو گیا۔ اس کا نہایت جامع احاطہ ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط پانے کے بعد اپنے امرا و عمائدینِ دربار سے ان الفاظ میں کیا۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ O (۲)

اس (ملکہ) نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اسے اجاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے۔

ملکۂ سبا کو یہ علم نہیں تھا کہ سلیمان نبی ہیں صرف بادشاہ نہیں۔ بادشاہوں، حکمرانوں کا آج بھی وہی عالم ہے جو ملکہ نے بیان کیا۔ امریکہ نے پورے ویت نام کو ایک وسیع و عریض قحبہ خانہ بنا دیا۔ یہ ملک گیری میں مبتلا لوگ اور قومیں جنگ کو صرف میدانِ جنگ تک محدود نہیں رکھتیں۔ یہ دور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا ہے اور آج اکیسویں صدی میں تہذیب کے ''زمانۂ عروج'' میں افغانستان اور عراق میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے جمہوریت کی فتح اور عوام کے حصولِ حقوق کا نام دیا جا رہا ہے۔ عراق میں ہر ماہ دس ہزار شہری مارے جا رہے ہیں اور وہ بھی امن کے فروغ کے نام پر۔ یہی روش عہدِ قدیم کے فاتحوں کی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کو نہایت بلند اخلاقی اصولوں کے تابع کر دیا۔ فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر آپ اسلامی لشکر کو واضح ہدایت عطا فرماتے تھے۔ موتہ کی جنگ کے لئے روانہ ہونے والے

لشکر کو بھی آپ نے یہ ہدایات دیں۔

۱۔ کسی مرحلے پر بدعہدی نہ کی جائے۔

۲۔ ہر طرح کی خیانت سے بچا جائے۔

۳۔ جو شریکِ جنگ نہ ہوں یعنی عورتیں، بچے، انتہائی بوڑھے لوگ اور کلیسا میں عبادت کرنے والے راہبوں سے تعرض نہ کیا جائے، ان کو قتل نہ کیا جائے۔

۴۔ کسی درخت، بالخصوص پھل دار درخت کو نہ کاٹا جائے۔

۵۔ کسی عمارت کو منہدم نہ کیا جائے۔

جب اسلامی لشکر اردن کے علاقے معان میں پہنچا تو مسلمانوں کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ قیصر روم ہرقل ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ بلقا کے قریب خیمہ زن اور جنگ کے لئے تیار ہے۔ ان ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ قبائل کے بھی ایک لاکھ فوجی موجود ہیں۔ مسلمان اس صورتِ حال کے لئے تیار نہ تھے۔ دو لاکھ کے لشکر کے مقابلے میں تین ہزار سرفروش۔ جنت کے عوض اپنی جانیں فروخت کرنے والے یہ اہلِ ایمان بہرحال انسان تھے۔ اس صورتِ حال نے انہیں پریشان بھی کیا اور حیران بھی۔ معان میں دو راتیں باہمی مشاورت میں گزریں۔ بہت سے صحابہ کا خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے اور مزید کمک بھیجنے کی درخواست کی جائے، لیکن دوسرے صحابہ نے کہا کہ اس سے بڑی اسلامی فوج اس سے پہلے کسی معرکے کے لئے ترتیب نہیں دی گئی، پھر فتح و شکست کا تعلق تو ہماری تعداد سے نہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت سے ہے۔ ہمارا کام تو لبیک کہنا اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے اپنے جذبات کا اظہار اشعار کی زبان میں فرمایا:

لکننی اسال الرحمان مغفرة

و ضربة ذات فرع تقذف الزبدا (۳)

میں تو اللہ رحمٰن سے مغفرت کا سوال کرتا ہوں اور اس کے ساتھ تیز دھار تلوار کے زخم کا سوال کرتا ہوں، جس سے جھاگ والا خون بہہ نکلے۔

اور انہوں نے کہا کہ جب اہلِ دل کا گزر میری قبر سے ہو تو وہ دعا کریں کہ الٰہی! اس غازی کو جنت میں جگہ دے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ نے جن جذبات کو شعر کا پیکرِ جمال عطا کیا وہی جذبات قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور آیات کی روشنی میں دوسرے صحابہ کے دلوں میں بھی موج زن تھے۔ یہ وہ تھے جو موت کو وہ پل

سمجھتے تھے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔ وہ دوست جو قرآنِ حکیم کی آیات کے ذریعے ان سے ہم کلام ہے اور یہ ہم کلامی ہر دور میں مسلمانوں کے دلوں کو راہِ حق میں ثبات عطا کرتی رہے گی۔ ربِ جلیل کی آوازِ معرکۂ موتہ کے شرکائے عظیم کو اپنا فرض یاد دلا رہی تھی اور وہ اپنے رب کے حضور دعا کر رہے تھے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ O (۴)

اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے، اور ہم سے اپنے کاموں میں جو زیادتی ہوئی ہے اسے معاف فرما دے اور ہمارے قدموں کو ثبات عطا فرما اور ہمیں کافروں کی قوم پر نصرت عطا فرما۔

معرکۂ موتہ کے مجاہدین، بالخصوص بدری اصحاب کو معرکۂ بدر شدت سے یاد آ رہا ہوگا جب اللہ نے میدانِ بدر میں مجاہدین کو شیطانی وسوسوں پر غالب کیا، ان کے دلوں کو مضبوطی عطا کی اور ان کے قدم جما دیئے۔ (۵)

ابتدائی دور میں اسلام لانے والے صحابہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ طائف یاد آ گیا جب دو اہلِ ایمان ایک پوری بستی کے کافروں اور ان کے گماشتوں، اوباشوں اور سنگ دل ساتھیوں کے مظالم کا نشانہ بنے تھے۔ ان دونوں نے صرف اپنے رب سے فریاد کی اور کسی انسان کی طرف نہ دیکھا اور جب رسول کے نعلین خون سے چپک گئے اور اس کے جسم سے خون بہہ کر پتھروں کو سرخ کر رہا تھا تو پہاڑوں کے فرشتے نے اجازت طلب کی کہ وہ اس بستی کو پہاڑوں کے درمیان پیس کر نابود کر دے، لیکن انسانیت کے مستقبل پر یقین رکھنے والے رحمتِ عالم نے فرمایا کہ نہیں۔ ان شاء اللہ انہیں ظالموں اور ان کی آنے والی نسلوں کے دلوں میں اسلام کی کونپل پھوٹے گی اور سرسبز درخت میں بدل جائے گی۔

بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ کو درخت کے نیچے اپنے رسول کے ہاتھوں پر اپنی بیعت یاد آ گئی۔ آخری سانس تک اسلام کی خاطر جہاد کرنے کی بیعت، بیعتِ رضوان کی وجہ بھی تو ایک مسلمان کے ناحق خون کی خبر (جو دراصل افواہ تھی) تھی اور یہ بیعت ان ایمان والوں نے کفر کے مرکز کے دامن میں کی اور اس عالم میں کہ ان کے پاس تلواروں کے علاوہ کوئی ہتھیار نہ تھا۔ نہ نیزے، نہ ڈھالیں، نہ خود، نہ زرہ بکتر، مگر یہ مسلمان دنیاوی اسباب اور نتائج کو خاطر میں لانے والے نہیں تھے اور انہیں یہ قوت ان کے رسول نے عطا کی تھی جس نے اپنے ساتھیوں کو توکل علی اللہ کی عظیم ترین مثال بنا دیا تھا۔ یہ وہ تھے کہ جنہیں صرف یہ یاد آیا کہ ان کا فرض کیا ہے اور نتیجے کی انہیں کیوں فکر ہوتی کیونکہ نتائج تو ان کا رب مرتب فرماتا تھا۔

سلام اور درود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کے ساتھیوں پر۔

معرکۂ موتہ میں شریک ہونے والے مجاہدوں نے ان باتوں کو اپنے ذہن میں دہرایا اور ایک دوسرے کو اپنی فکر میں شریک کیا اور یہ طے کیا کہ وہ اپنا فرض انجام دیں گے اور کفر کے اس سیلاب سے ٹکرا کر انسانیت کے مستقبل کی تعمیر کریں گے۔

صحابۂ کرام کا دل ٹھہر گیا اور معان میں دو راتیں گزارنے کے بعد اس لشکر نے رومیوں کی طرف پیش قدمی شروع کی، یہ پیش قدمی کوہسار پر تتلی کی یلغار کی طرح تھی، اور اس وقت کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ یہ رومی شہنشایت کے خاتمے کا دیباچہ ہے۔ انسانی اخلاق فولاد اور آہن سے ٹکرا کر انسانیت کو سرخ رو کرنے جا رہا تھا۔

بلقا کے مقام مشارف میں ہرقل کی فوجیں اور مختصر سا اسلامی لشکر دونوں آمنے سامنے تھے۔ مسلمان ''موتہ'' کی جانب خیمہ زن ہوئے اور تین ہزار مجاہدوں نے دو لاکھ لشکریوں کے مقابل صف آرا کی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش بینی کے مطابق لشکرِ اسلام کے سالارِ اول حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، اور شہادت یوں پائی کہ جیسے انہوں نے عروسِ اجل کو گلے سے لگا لیا۔ وہ دشمن کی صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے قلبِ لشکر میں گھس گئے۔ نیزے ان کے جسم میں گڑ گئے۔

ادھر مدینۂ منورہ میں اللہ تعالیٰ اس معرکے کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں دکھا رہا تھا کہ سارے فاصلے سمٹ گئے تھے اور جنگ کی تفصیلات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دیکھ رہے تھے جیسے انسان اپنے کفِ دست کی لکیروں کو دیکھتا ہے۔ اسلامی پرچم کو زید رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب نے سنبھال لیا اور یوں دادِ شجاعت دی کہ جوانانِ روم کے قدم اکھڑنے لگے۔ جب جنگ میں شدت آئی تو حضرتِ جعفر نے اپنے گھوڑے کی کوچیں کاٹ دیں اور گھوڑے سے کود پڑے کہ کہیں گھوڑا جنگ کی تاب نہ لا کر راہِ فرار اختیار نہ کرے۔ دشمنوں پر وار کرتے ہوئے ان کے واروں کو روکتے ہوئے حضرت جعفر کا داہنا ہاتھ کٹ گیا اور انہوں نے جھنڈا اپنے بائیں ہاتھ میں سنبھال لیا۔ جب اللہ کے شیر کا بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا تو اسلامی پرچم کو سرنگوں ہونے سے بچانے کے لئے جعفر رضی اللہ عنہ نے پرچم کو کسی طرح اپنے سینے سے لگایا اور جب انہیں وہ زخم لگا جو ان کی شہادت کا سبب بنا تو پرچم کو گرنے سے پہلے حضرت عبداللہ بن رواحہ نے سنبھال لیا۔ ادھر مدینۂ منورہ میں جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بتا رہے تھے کہ لو جعفر بھی اپنے خالق کے حضور پہنچ گئے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جنگِ موتہ کے غازیوں میں شامل تھے۔ صحیح البخاری کی کتاب المغازی میں ان کی روایت ہے کہ میں نے غزوۂ موتہ میں جعفر کی لاش پر کھڑے ہو کر ان کے زخم کا شمار کیا

تو ان کے جسم پر پچاس زخم تھے اور ان میں سے کوئی زخم پشت پر نہیں تھا۔ (۶)

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اور آپ کے صحابہ) کے اخلاق کے اس مطالعے میں واقعاتی تفاصیل سے گریز کیا ہے لیکن غزوۂ موتہ کے فوق البشر معرکے کی کچھ تفصیل اس لئے پیش کی جارہی ہے کہ اس کے بغیر نہایت بلند اخلاقی اوصاف، ثابت قدمی، توکل علی اللہ اور اللہ و رسول کی اطاعت اور ان صفات کے اجر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ حضرت جعفر کو اللہ تعالیٰ نے یہ اجر عطا کیا تو انہیں بہشت میں دو بازو عطا کئے اور ان بازوؤں کی مدد سے وہ جنت کی فضاؤں میں پرواز کرتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں ذوالجناحین اور جعفر طیار کا لقب مل گیا۔ دنیا میں بھی حضرت جعفر کا یہ لقب ان کا نشان ٹھہرا، صحیح البخاری میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

كَانَ ابن عمر اِذَاحيّا ابن جعفر قَالَ السلامُ عليكَ يا ابنِ ذِى الجنا حَين (٦)

حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہ) جب جعفر (رضی اللہ عنہ) کے بیٹے کو سلام کرتے تو کہتے اے ابنِ ذی الجناحین (دو بازوؤں والوں کے بیٹے) آپ پر سلام ہو۔

اور ان جانثاروں کی شہادت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شہادتوں کے منظر معجزے کے طور پر دکھائے گئے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے جاتے تھے کہ اب علَم زید کے ہاتھوں میں ہے اور اب زید شہید کر دیئے گئے۔ اب علَم جعفر کے ہاتھوں میں ہے، اور جعفر بھی شہید ہو گئے۔ اب ابن رواحہ نے علَم اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ پھر وہ بھی شہید ہو گئے اور پھر علَم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے، یہاں تک کہ اللہ نے ان کے ہاتھ پر فتح عنایت کی۔ صحیح البخاری کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فان اخذ الرأية سيفٌ من سيوفِ اللهِ حتى فتح الله عليها (٨)

اور پھر علم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (خالد بن ولید) نے علَم اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور اللہ نے اس ہاتھ پر فتح عنایت فرمائی۔

غزوۂ موتہ کے نتائج اور اثرات کے بارے میں واقعات کے بیان کے بعد ہم گفتگو کریں گے، لیکن اس حدیث کی روشنی میں یہ کہنا درست ہوگا کہ غزوۂ موتہ میں بھی مسلمانوں کو آخر الامر فتح حاصل ہو گئی اور یہ فتح اسی نوعیت کی تھی جیسے صلح حدیبیہ کو ربِ جلیل نے ''فتحِ مبین'' قرار دیا تھا۔ صلح کے موقع پر حکمتِ صلح حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صحابیِ کبیر پر بھی روشن نہیں ہوئی تھی۔ بعد کے واقعات کے سلسلے نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو واضح کر دیا۔

اب آیئے غزوۂ موتہ کے واقعات کی طرف۔ حضرت خالد بن ولید نے لشکرِ اسلامی کی کمان سنبھالتے ہی ذاتی شجاعت اور فنِ حرب میں مہارت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ انہیں اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے جرنیل اور کمان دار کا مرتبہ حاصل ہوگیا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سارے دن رومیوں کے مقابل قتال کرتے رہے، اور اس شان سے کہ رومی سپاہی ان کے سامنے آنے سے کترا رہے تھے۔ خالد بن ولید اپنی موت کے تصور سے بھی بے نیاز ہوکر دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔ حضرت خالد سے حضرت قیس بن ابی حازم نے روایت کیا ہے کہ غزوۂ موتہ میں میرے ہاتھ سے نو تلواریں جہاد کرتے ہوئے ٹوٹی تھیں، اور میرے ہاتھ میں یمن کی بنی ہوئی چوڑے پھل کی تلوار رہ گئی تھی۔ (۹)

حضرت خالد بن ولید رومیوں کو جہنم پہنچاتے رہے اور ان کا ذہن مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح مسلمانوں کو میدانِ جنگ سے نکالیں، اور اس طرح کہ دشمن کو تعاقب کی ہمت نہ پڑے۔ جنگِ احد میں جب خالد بن ولید قریش کے لشکر میں تھے تو انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ قریش جنگ کو اپنے حق میں نہ موڑ سکے اور یہ عجب ماجرا ہوا کہ بظاہر شکست خوردہ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔

مومن اللہ کے نور میں چیزوں کو دیکھتا ہے، اور خالد کے ذہن میں ایسی حکمتِ عملی آئی کہ تباہی سلامتی میں بدل گئی۔ دوسرے دن جب جنگ شروع ہوئی تو حضرت خالد مقدمہ کی جگہ ساقہ کو لے آئے، یعنی پہلی صفوں میں جو سپاہی تھے ان کی جگہ پچھلی صفوں کے سپاہیوں نے لے لی اور اسی طرح آپ نے میمنہ کے سپاہیوں کو میسرہ میں بھیج دیا اور میسرہ کے سپاہی میمنہ میں آگئے۔ نئے چہروں کو دیکھ کر رومی پریشان ہوگئے۔ اللہ جل جلالہٗ نے ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم کردیا اور وہ سمجھے کہ مسلمانوں کی مدد کے لئے تازہ دم فوج آگئی۔ تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد اپنی صفوں کو درست اور قائم رکھتے ہوئے حضرت خالد نے اپنے لشکر کو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹانا شروع کردیا۔ رومی سمجھے کہ یہ مسلمانوں کی عسکری چال ہے اور شاید ان کے مزید سپاہی پیچھے موجود ہیں کہ یہ ان کے ساتھ مل کر زبردست حملے کرنے جارہے ہیں، یا پھر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ رومی صحرائی علاقے میں آجائیں۔ کیونکہ عرب صحرائی جنگ میں ان پر یقیناً سبقت رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رومی اپنے علاقے کی طرف سمٹ گئے اور اسلامی لشکر بحفاظت مدینہ منورہ پہنچ گیا۔

جنگ میں فتح وشکست کا اندازہ نتائج وعواقب سے لگایا جاتا ہے۔ رومی اس عہد کی عالمی سپر پاور تھے اور مسلمان ان سے جا ٹکرائے اور وہ بھی ان کے علاقے میں۔ پھر عددی تفاوت پر نظر ڈالئے۔ دو لاکھ کے مقابلے میں تین ہزار سپاہی۔ یعنی کچھ کم سات سو رومی سپاہیوں کے مقابل ایک مسلمان سپاہی۔ دنیا کی عسکری تاریخ نے ایسا معرکہ نہیں دیکھا تھا۔ نتیجتاً دور ونزدیک کے علاقوں میں غزوۂ موتہ کی داستانیں اور

مسلمانوں کی شجاعت کے قصے پھیل گئے۔ ویسے بھی کافر کا دل موت سے لرزتا ہے۔ خود عرب کے مشرک اور عیسائی کانپ اٹھے اور انہیں اپنا مستقبل نظر آنے لگا۔ معرکۂ موتہ مستقبلِ قریب میں مسلمانوں کی وسیع اور متواتر فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

جنگوں کا فیصلہ محض اسلحۂ جنگ اور عددی برتری سے نہیں ہوتا بلکہ جنگیں اخلاق کی قوت سے جیتی جاتی ہیں۔ اللہ مسلمانوں کی نگہبانی فرماتا ہے اور ان کے ذریعے عالم اسباب میں اپنی مشیت نافذ فرماتا ہے۔

جنگِ موتہ کے کئی اور پہلو اخلاقی نقطۂ نظر سے مطالعے کے مستحق ہیں۔ پہلی بات تو شجاعت کے انداز اور نمونے (Pattern) کی ہے۔ اس معرکے میں مسلمان شہدا کی تعداد بارہ ہے جس میں تین سالارانِ لشکر بھی شامل ہیں۔ اس سے ہمیں مسلمان سرداروں اور سربراہانِ شعبۂ جات حیات کی اس اخلاقی صفت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ خطروں کے مواقع پر سب سے آگے ہوتے تھے اور اپنے ساتھیوں اور ہمراہیوں تک خطرات کو آنے سے روکتے تھے، ورنہ اُس عہد کے معرکوں کے تفصیلی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آج کی طرح سالار اپنے سپاہیوں کی حفاظت میں اگلی صفوں سے پیچھے ہی رہتے تھے اور ان کی حفاظت کے لئے ان کے ماتحت اور سپاہی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ جنگِ موتہ میں مسلمان امیرانِ لشکر نے اس بے خوفی اور جگرداری سے دادِ شجاعت دی کہ رومی فوجی ان میں ہی الجھ کر رہ گئے، اور حضرتِ جعفرِ طیار کی نعش کی کیفیت کی بیان کردہ تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ان کے جسم پر زرہ بکتر نہیں تھی۔ شہادت کی موت کے ان عاشقوں سے بھلا کون بازی لے جا سکتا ہے۔ جانثاری کی یہ روایت غزوۂ بدر ہی سے شروع ہوگئی تھی جب حضرت عوف بن حارث رضی اللہ عنہ نے شوقِ شہادت میں اپنی زرہ اتار دی اور دشمن کی صفوں میں گھس کر جنگ کرتے ہوئے شہادت پائی۔

جنگِ موتہ کے رومی مقتولین کی تعداد ہمیں نہیں معلوم، لیکن اس بات سے اس کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس دن حضرت خالد بن ولید کے ہاتھوں سے نو تلواریں ٹوٹیں، اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور حکمتِ عملی سے رومی فوج نے پیش قدمی کی جگہ پیچھے ہٹنے میں عافیت جانی۔

جب غزوۂ موتہ کے مجاہد مدینہ منورہ واپس پہنچے تو صحابۂ کرام کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے۔ جب غزوۂ موتہ کے مجاہد شہر میں داخل ہونے لگے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر آنے والے ہیں۔ اس پر زبانِ رسالت سے یہ کلمات بلند ہوئے کہ یہ بھاگ کر آنے والے نہیں بلکہ پلٹ کر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ ''فراری'' نہیں بلکہ ''کراری'' ہیں۔ آپ کے یہ الفاظ غزوۂ تبوک کی پیش بینی اور پیش گوئی کا درجہ رکھتے ہیں۔ معرکۂ موتہ کے بعد غزوۂ تبوک نے

دنیا کی سپر پاور روم کی ہیبت وسطوت کے قلعوں میں شگاف ڈال دیئے اور بعد میں سلطنتِ روما نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کی عظمت و ''کبریائی'' داستانِ پارینہ بن گئی اور معرکہ موتہ اور غزوۂ تبوک کی ایسی ہم رشتگی کی بنا پر فتح مکہ کے ذکر سے پہلے غزوۂ تبوک کا ذکر (تاریخی تسلسل کو قدرے مجروح کرتے ہوئے) مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غزوۂ تبوک میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی محاسن اور اُبھر کر سامنے آئے۔ عسرت اور سختیوں کا مقابلہ کیسے کیا جاتا ہے؟ اورصدق کی وسعتیں اور اہمیت کیا ہے؟ یہ غزوۂ تبوک سے پوچھئے۔ صحابہ کی یہ پامردی اور صدق شعاری نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کا کامل نمونہ ہے۔

غزوۂ تبوک

انفاق فی سبیل اللہ کی لافانی مثالیں،

غزوۂ موتہ نے اسلام کو عالمی باطل قوتوں کا مقابل بنادیا۔ اس کے فوراً ہی بعد فتحِ مکہ نے اسلام کو جزیرہ نمائے عرب کی غالب ترین قوت بنادیا، اگرچہ مرتے ہوئے کفر کی حرکتِ مذبوحی نے جارحیت کا لبادہ اوڑھ کر غزوۂ حنین کو اسلامی تاریخ کا حصہ بنایا۔ جنگِ موتہ کے بعد رومیوں کو شدت سے احساس ہوا کہ اسلام اب پیش قدمی کے مرحلے میں داخل ہوگیا ہے۔ تین ہزار سپاہیوں نے دولاکھ رومی فوجیوں کے مقابل سرخ روئی حاصل کرکے ان کی ساکھ کو نقصان پہنچایا تھا۔ اللہ کے ان سپاہیوں کو اس بات پر بھی یقینِ کامل تھا کہ ان معرکوں کا مقصد یہ ہے کہ اسلام تقدیرِ کائنات اور تقدیرِ انسان بن کر رہے اور دوسرے تمام نظاموں پر غالب آکر رہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ط وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا O (۱۰)

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ ہر دین (اور نظام) پر غالب آکر رہے۔ اور اس حقیقت پر گواہی دینے کے لئے اللہ کافی ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے، اور دوسرے نظام، مذہب ہیں۔ قرآنِ حکیم اس حقیقت پر شاہد ہے کہ دوسرے باطل نظام بھی ''دین'' ہیں۔ وہ راستے جو ہر معاملے میں اللہ کے عطاکردہ دین کی مخالفت کرتے ہیں۔

یہ ایک ضمنی مگر بنیادی بات جملۂ معترضہ بن کر آگئی۔ رومیوں نے اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے

پیش نظر یہ حقیقت سمجھ لی کہ اسلام ایک سیلِ زمیں گیر بننے والا ہے، اور اس کے اثر ونفوذ کو اس وقت نہ روکا گیا تو پھر اس کا مقابلہ ممکن نہ ہوگا۔ جنگِ موتہ نے رومی سرحدوں میں روم کے اقتدار کو للکارا تھا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر قیصر روم نے جنگِ موتہ کے چند مہینوں کے بعد ہی ایک فیصلہ کن جنگ کی ٹھان لی۔ اس معرکہ کے لئے اس نے عرب کے عیسائی قبائل کو بھی آمادہ کیا۔ شام کے علاقے سے واپس آنے والے تاجر رومیوں کی تیاری کی خبر لے کر آتے تھے۔ مدینہ کی شہری ریاست میں خبرداری اور جاسوسی کا نظام خاصا منظم تھا، اسی لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رومیوں، آلِ غسان اور دوسرے قبائل کی عسکری تیاریوں اور سرگرمیوں کی خبریں مل رہی تھیں۔ اس پر اضافہ کیجئے منافقوں کی کدورتوں اور سازشوں کا جس کی علامت مسجدِ ضرار ہے۔ اُدھر مسلمان رومیوں کے خطرے سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر کر رہے تھے اور ادھر منافقوں نے اپنے گمان کے مطابق اسلام میں انتشار پیدا کرنے کے لئے ایک مسجد کی تعمیر شروع کی اور یہ سازش بہت گہری تھی۔ انہوں نے باہمی مشورے سے یہ بات طے کی کہ مسجد میں پہلی جماعت کی امامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں تاکہ اہلِ مدینہ میں مسجد کا اعتبار قائم ہو اور پھر یہ مسجد ابو عامر ''راہب'' کے حوالے کر دی جائے اور اس میں اسلحہ جمع کیا جائے کہ ایک طرف رومی مدینہ پر حملہ کریں تو دوسری طرف خانہ جنگی کا آغاز ہو، لیکن وہ یہ بھول گئے کہ ربِ محمدؐ ان کے سینوں میں چھپی ہوئی ہر سازش اور ہر تدبیر سے باخبر ہے۔

موسم سخت تھا۔ مدینے میں خاصے دنوں سے بارش نہیں ہوئی تھی اور عسرت وتنگ دستی کے زمانے میں کھجوروں کی فصل تیار تھی۔ کھجوروں کو توڑنے، انہیں خشک کرنے اور ذخیرہ کرنے کے اہم کام درپیش تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی تیاری کا اعلان فرما دیا اور یہ اعلان بہت صاف تھا۔ آپ نے جہاد کی تیاری کرنے والوں کو بتا دیا کہ تبوک کا سفر کرنا ہے اور رومیوں کو ان کی سرحدوں پر روک کر ان کے خلاف پیش قدمی کرنی ہے۔ اس سے پہلے آپ کی سنت یہ تھی کہ لشکر کی منزل اور راستے کے بارے میں اخفا فرماتے تھے، لیکن شام کی سرحد تک سفر بہت مشکل اور کٹھن تھا اسی لئے شرکائے جہاد کو تمام نشیب وفراز اور آنے والی آزمائشوں سے باخبر کرنا ضروری تھا۔ اس کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ مجاہدوں کی جاں فروشی اور شوقِ شہادت کھل کر سامنے آجائے اور وہ ثبات وحوصلے کے ساتھ رومیوں سے جنگ کے لئے اپنے آپ کو تیار کرلیں۔ مدینہ، مدینے کی مضافاتی بستیوں اور مکہ معظمہ میں بھی اہلِ ایمان کو اس ہونے والے معرکے کی اطلاع دے دی گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی تیاریوں کے لئے مسلمانوں سے سامانِ جنگ، رسد اور ہر قسم کے عطیات کی اپیل کی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہر طرف سے مسلمانوں کے قبائل مدینہ منورہ میں جمع ہونے لگے۔ ان کے

پاس جو کچھ تھا وہ بھی ساتھ لے آئے اور انصار و مہاجرینِ مدینہ نے اللہ اور رسول کی خوشنودی کے لئے مال و دولتِ دنیا کو ''بتانِ وہم و گماں'' سمجھتے ہوئے راہِ خدا میں قربان کر دیا۔ یہ اُس نبی کے شیدائی تھے جس نے دنیا کی ساری دولت کو ایک مسلمان کے چہرے پر پیدا ہونے والی مسکراہٹ سے کم سمجھا۔ اسلام نے اقتدار، تفاخر اور دولت کے بتوں کو مسلمان کے خانۂ دل سے نکال دیا۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی مسلمان کی نظر آخرت پر رہتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے بار بار اس دنیا کی زندگی کو دھوکہ اور فریبِ نظر اور فریبِ فکر قرار دیا ہے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ مسلمان کاروبارِ حیات سے کنارہ کش ہو جائے۔ مفہوم یہ ہے کہ نظر عاقبت پر رہے اور اس حقیقت پر کہ یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہ دنیا تو ایک آزمائش ہے، کافر اسی دنیا اور اس کے عیش و آرام میں گم ہو جاتا ہے اور مومن اس دنیا میں ہر جدوجہد آنے والی زندگی کے لئے کرتا ہے۔ اس دنیا کا مال و متاع اسے اپنی منزل سے بے خبر نہیں کرتا اور وہ اپنے اصل ٹھکانے کو نہیں بھولتا۔ ویسے اس دنیا کی لذتوں میں گم ہو جانا بہت سہل ہے، صرف اللہ کی محبت اور خیالِ عقبیٰ ہی اس سے بچا سکتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ O (۱۱)

انسانوں کے لئے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، (اعلیٰ نسل کے) چُنے ہوئے گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنائی گئی ہیں (مگر یہ سب اسی چند روزہ) دنیا کا مال و متاع اور سامان ہیں اور بہتر ٹھکانا تو اللہ کے پاس ہے۔

اور اسی سلسلۂ کلام میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اس بہتر ٹھکانے کی نشان دہی کرائی ہے۔ وہ ٹھکانا تقوے سے حاصل ہوتا ہے۔ جنت کے باغوں میں آبِ رواں ہے اور ہمیشگی کی زندگی۔ اس ہمیشگی کی زندگی میں پاکیزہ بیویاں رفاقتِ ابدی کے لئے ہیں اور اللہ کی رضائے مسلسل ان جنتیوں کے لئے اور اس ہمیشگی کی جنت کے مقابل

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ O (۱۲)

اور اس دنیا کی زندگی کیا ہے، سوائے دھوکے کی مٹی کے اور ظاہر فریبی کے۔

اور دھوکا ہونے کے ساتھ ساتھ اس دنیا کا سارا سرمایہ جو فساد فی الارض، ناہمواریوں، مناقشات کا سبب بنتا ہے کتنا چھوٹا اور کم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ربانی پیغام لے کر انسانیت کی طرف آئے اس کی اصل و اساس دنیا کی یہی بے وقعتی ہے۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا O (۱۳)

اے رسول کہہ دیجئے کہ دنیا کا سرمایہ اور پونجی بہت مختصر ہے اور آخرت تقویٰ اختیار کرنے والے کے لئے بہت بہتر ہے اور تم پر ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تقویٰ مومن کے مجموعی طرزِ حیات وعمل کا نام ہے۔ اس دنیا اور اس کی زینتوں سے دل اُٹھائے بغیر تقویٰ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے حصول کے نسخے کا جزوِ اعظم انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ انفاق تزکیے کا راستہ ہے جس میں خرچ کی جانے والی دولت، بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اس کو قرآنِ حکیم نے کھیتی کی مثال کے ذریعے پیش کیا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ O اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ O (۱۴)

جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں، اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس (عمل اور چیز) کو چاہتا ہے فراوانی عطا کرتا ہے اور بڑھا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علیم ہے۔ جو لوگ اپنا مال ومتاع اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ (کسی کو) ایذا دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ تو خوف ہوگا اور نہ حزن وغم کیتی۔

ان آیات میں انفاق کی برکات، اس کے اخلاقی پہلو اور معاشرے پر اس کے اثرات سب سمٹ آئے ہیں۔ زکوٰۃ، انفاقِ فی سبیل اللہ کا ایک جز ہے جسے اسلام کے ارکان میں شامل کردیا ہے۔ یوں انفاق شرائطِ ایمان میں بھی شامل ہے اور مسلمان کی اخلاقی صفات میں بھی۔ ان آیات میں اخلاقی پہلو کو یوں اُبھارا گیا ہے کہ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے والے نہ تو کسی پر احسان جتائیں اور نہ ایذا رسانی کریں۔ احسان جتانا خود ایذا رسائی ہے کیونکہ احسان جتانے والا دوسرے کی عزتِ نفس سے کھیلتا ہے، اور انفاق کا بنیادی رشتہ خود اپنی ذات کے استحکام سے ہے کیونکہ یہ کائنات انفاق کے عمل سے مومن کی ذات میں گم ہوجاتی ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوے کے لئے مسلمانوں کو سامانِ جنگ، وسائل حمل و

نقل، اجناس اور دوسری ضروریات کی فراہمی کے لئے تعاون کی دعوت دی تو یوں لگا کہ انفاق کی گھٹا برسنے کے لئے آسمانِ اخلاق پر تُلی کھڑی تھی۔ ہر طرف سے عطیات کی بارش ہونے لگی۔ یہ دل کے غنی افراد کا معاشرہ تھا اور مال و دولتِ دنیا کو خاطر میں نہ لانے والوں کا معاشرہ تھا۔ آسودہ دل اور حاجات سے بے نیازی کا مرقع تھا۔ بے نیازی سے مراد یہ ہے کہ افراد کا سرمایہ، معاشرے کا سرمایہ تھا۔ ہر شخص رسول کی دعوت پر سب کچھ لے کر یوں دوڑا آیا جیسے دنیا میں غرق معاشروں میں عزت لینے کے لئے دوڑتے ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے شام بھیجنے کے لئے ایک تجارتی قافلہ تیار کیا تھا۔ قافلے میں دوسو اونٹ تھے۔ سامانِ تجارت خریدنے کے لئے حضرت عثمان نے کم و بیش تیس بتیس سیر چاندی الگ کردی تھی۔ انہوں نے یہ اونٹ اور چاندی اپنے رسول کی خدمت میں پیش کردی۔ اس کے بعد اس امت کے غنی رضی اللہ عنہ نے سو اونٹ اور خرید کر غزوے کے لئے پیش کیے اور ایک ہزار دینار حضور کے قدموں میں لاکر رکھ دیئے۔ اس عمل سے دیناروں کا سونا اور بھی چمکنے لگا۔ عثمانِ غنی یوں ہی سامان جمع کرتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے رہے یہاں تک کہ سونے چاندی کے سکّوں کے علاوہ آپ نے مجاہدوں کے لئے نو سو اونٹ اور سو گھوڑے فراہم کردیئے۔ نبیٔ مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرے پر خوشی کی کرنیں یوں چمکنے لگیں کہ مدینہ منورہ کا منور ماحول اور بھی روشن اور پرنور ہوگیا۔ جو ذاتِ مقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے متاعِ دنیا کو ایسا بوجھ سمجھتی تھی کہ کاشانۂ نبوت میں اگر نہات معمولی مقدار میں سونا پڑا رہ جاتا تو آپ اس وقت تک سو نہیں پاتے تھے جب تک اسے راہِ مولائے کریم میں صدقہ نہ کر دیتے۔ اس دن حضرتِ عثمان غنی کے پیش کردہ دینار، ان کی چمک اور ان کی جھنکار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس درجے بھلی لگ رہی تھی کہ آپ ان کو اپنے دامن سے فرش پر ڈالتے جاتے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مرتبے پر اپنے اصحاب کو باخبر کرتے جاتے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کے بعد عثمان کے کسی عمل کا نقصان انہیں نہیں پہنچے گا۔ اس جملے میں حضرت عثمانِ غنی کے اخلاق اور کردار پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد بھی ہے اور آپ کی دعا بھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرتِ عباس، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم نے دل کھول کر عطیات پیش کئے تھے۔ حضرت عاصم بن عدی نے ۱۵ ہزار سیر کھجور کے ذخائر مجاہدوں کے لئے پیش کردیئے۔ مدینہ منورہ کی مومن عورتوں کے پاس جو زیور تھے وہ انہوں نے پیش کردیئے۔ عورت کی فطرت میں آرائش و زیبائش کا جو شوق ہے اس کو نظر میں رکھئے تو اس ایثار کی پہنائیوں تک رسائی ہوسکتی ہے۔ حضرت ابوعقیل انصاری رضی اللہ عنہ نے رات بھر ایک کھیت کو کنویں سے پانی نکال کر سینچا اور رات بھر کی اس مشقت کے معاوضے

کے طور پر انہیں چار سیر خشک کھجوریں ملیں۔ دو سیر کھجوریں وہ بیوی بچوں کے لئے چھوڑ آئے اور دو سیر کھجوریں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کھجوروں کو قیمتی مال و اسباب کے اوپر رکھ دو تا کہ برکت ہو یا آپ نے فرمایا کہ انہیں تمام عطیات کے اوپر بکھیر دو۔ یہ تھا ایک غریب صحابی کے خلوص کا اعتراف۔ سچ ہے کہ خلوص ہی اعمال کے وزن کا پیمانہ ہے۔ اسی موقع پر حضرت عمر فاروق نے اپنے اثاثے کا آدھا حصہ خدمتِ نبوی میں پیش کر دیا اور حضرت صدیق اکبر نے اپنا مکمل سرمایہ اور اثاثہ اپنے نبی کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ عظیم مثال، تاریخ میں بے مثال ہے اور اسے علامہ اقبال نے اپنے بے مثال اسلوب میں نظم کر دیا، اس طور پر کہ پوری صورتِ حال آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے:

اک دن رسولِ پاک نے اصحاب سے کہا — دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مال دار
ارشاد سن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اُٹھے — اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور — بڑھ کر رکھے گا قدم آج میرا راہوار
لائے غرض کہ مال رسولِ امیںؐ کے پاس — ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پوچھا حضور سرورِ عالمؐ نے ''اے عمر! — اے وہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟ — مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار''

کی عرض ''نصف مال ہے فرزند زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار''

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آ گیا — جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت — ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
مِلکِ یمین و درہم و دنیا و رخت و جنس — اسپ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضور ''چاہئے فکرِ عیال بھی'' — کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
''اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر — اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس''

عطیات و صدقات اور مالی تعاون سے قطعِ نظر مدینۂ منورہ اور مدینے کی قریبی بستیوں سے مسلمانوں کے ہجوم مدینے کا رخ کر چکے تھے۔ ان میں سے بہت سے نئے مسلمان تھے لیکن سرورِ کائنات

صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں نے ایک بار بھی شرکت کرنے والوں کے قلب ونظر کی دنیا بدل دی تھی۔ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے اور جان دینے کو یہ نسخۂ بقائے دوام سمجھتے تھے، لیکن تبوک تک کے طویل سفر کے لئے مسلمانوں کے پاس سواریاں نہیں تھیں۔ بیماروں اور ضعیفوں کے علاوہ زادِ سفر نہ رکھنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس سفر جہاد میں شریک نہ ہوسکنے والے کے بارے میں فرمایا کہ ان پر اعتراض کی گنجائش نہیں، اور جن کے لئے سواریاں مہیا نہ کی جاسکیں ان کے اخلاق واخلاص اور اسلامی کردار کو قرآنِ حکیم نے ایک آیت میں یوں سمیٹ لیا ہے کہ ایک آیت بیان کا دفتر بن گئی ہے۔

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُمَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ص تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَO (۱۵)

اوران لوگوں پر بھی تنقید اور اعتراض کی گنجائش نہیں جنہوں نے خود حاضر ہوکر آپ سے سفر کے لئے سواریوں کی درخواست کی اور جب آپ نے کہا کہ تمہارے لے جانے کے لئے سواریاں نہیں تو وہ لوٹ گئے اور اس طرح کہ ان کی آنکھوں سے رنج والم کے آنسو جاری تھے (اور وہ اس بات پر افسردہ تھے) کہ وہ اپنے طور پر جہاد میں شرکت کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔

اور ایک گروہ وہ بھی تھا کہ ان کے پاس دولت اور وسائل تھے لیکن انہوں نے پیچھے رہ جانے اور اپنے گھروں میں بیٹھے رہنے کو پسند کیا۔ قرآن پاک نے ان کے بارے میں واشگاف انداز میں فرمادیا کہ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ٹھپّا لگادیا اور وہ اس حقیقت تک نہ پہنچ سکے کہ ان کا رویہ کس طرح اور کس حد تک ان کی تباہی کا سبب ہوگا۔ (۱۶) یہ لوگ اپنے نفاق میں اس درجے جری تھے کہ بہانے کر کے اور عذر تراش کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ جانے کی اجازت طلب کرتے۔ اللہ کا رسول ان کی منافقت سے خوب واقف تھا اور انہیں گھروں پر رہ جانے کی اجازت دے دیتا۔ اس پر یہ بڑی ڈھٹائی سے دوسروں کو مشورہ دیتے کہ اس گرمی میں گھروں ہی میں رہنے میں عافیت ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجٰهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ط قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ط لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَO (۱۷)

یہ پیچھے رہ جانے والے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جانے کے بعد اپنے گھروں میں بیٹھے رہنے پر خوش ہیں۔ انہوں نے اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے کو ناپسند کیا اور انہوں نے دوسروں سے بھی کہا کہ اس گرمی میں (جہاد کے لیے)

مت نکلو۔ ان سے کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ تو اس سے کہیں زیادہ شدید اور گرم ہے۔ کاش یہ لوگ (اپنے نفع نقصان کو) سمجھتے ہوتے۔

غزوۂ تبوک کی بڑی اہمیت اس نکتے میں بھی ہے کہ منافقوں کے بارے میں تواضع کو اختیار کرنے والے رسول سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ آپ ان میں سے کسی کے لئے استغفار نہ فرمائیں، کسی کی نمازِ جنازہ ادا نہ فرمائیں اور کافروں کے ساتھ ساتھ منافقوں پر بھی شدید ہو جائیں (۱۸) سورۂ توبہ کی تفہیم غزوۂ تبوک کے حوالے کے بغیر ممکن نہیں۔ اور ربِ ذوالجلال نے ان مومنوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے جو محنت مزدوری کر کے اپنے معاوضے اور یافت کو ملت کی بہبود کے لئے پیش کر دیتے تھے۔ ایک انصاری صحابی کی دو سیر کھجوروں کے عطیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر دانی اور اعترافِ خلوص کا واقعہ پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ منافق اس خلوص کا مذاق اُڑاتے اور نتیجتاً اللہ تعالیٰ نے ان کی جڑ کاٹ دی۔ ان منافقوں نے غزوۂ تبوک سے جان ''چھڑانے'' کے لئے جو عذر تراشے ان میں ڈھٹائی، بے حیائی کے ساتھ ساتھ تمسخر کا بھی پہلو تھا۔ اور تمسخر بھی کس کے ساتھ؟ اللہ کے رسول کے ساتھ۔ جب غزوۂ تبوک کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ بنوسلمہ کے جد بن قیس سے کہا کہ کیا تم رومیوں سے جہاد کا ارادہ رکھتے ہو۔ اس بدبخت نے جواب دیا کہ ''یارسول اللہ! مجھے معاف رکھیں۔ مجھے فتنے میں مبتلا نہ کریں۔ واللہ! میری قوم جانتی ہے کہ عورتوں سے مجھے جتنی رغبت ہے کسی دوسرے کو نہیں۔ جب رومیوں کی گوری گوری عورتوں کو دیکھوں گا تو صبر نہیں کر سکوں گا اور گناہ میں مبتلا ہو جاؤں گا۔''

اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا تھا کہ رومیوں کا مقابلہ کرنے جو لشکرِ اسلام جا رہا تھا اس کا ہر سپاہی اخلاق کی بلندی، بے غرضی، حبِ الٰہی اور اطاعتِ رسول کی تصویر ہو، اس میں کوئی دنیاوی لالچ اور غرض نہ ہو، اس لئے منافق اور مذبذب اور ایمان کے کمزور مسلمان بھی جھٹک کر الگ کر دیئے۔ ہم نے معرکۂ موتہ اور غزوۂ تبوک کو ہم ردیف بنانے کے لئے تاریخی ترتیب بدل دی، مگر قارئین کرام غزوۂ حنین کو یاد کریں جب کہ مسلمانوں کے ذہن میں اپنے مشن کی عظمت اور دینِ حق کی حقانیت اور مقصد کی سربلندی کی جگہ اپنی عددی برتری کا غرور پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جب ہم تعداد میں کم تھے اور ہمارے ہتھیار بھی کافروں کے اسلحۂ جنگ سے معیار میں کم تر تھے تو بھی کافروں کو مسلسل شکست ہوتی رہی اور آج ہمارا کون مقابلہ کرے گا۔ وقتی طور پر مسلمان یہ نکتہ بھول گئے تھے کہ فتح تو اللہ کی خوشنودی سے حاصل ہوتی ہے اور مسلمان کا کام تو فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر اپنا فریضہ انجام دینا ہے۔ تبوک کے راہی وہ تھے جو اپنے اللہ اور اپنے رسول کے فرمان پر لبیک کہتے ہوئے اس سفرِ شوق و جہاد پر مدینۃ الرسول سے

پر مدینۃ الرسول سے نکلے تھے۔ اگرچہ شمسی تقویم کے مطابق وہ اپریل (۶۳۰ء) کا مہینہ تھا، سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ تیس ہزار قدسی نفس انسانوں کا لشکر مدینۂ منورہ سے اس عالم میں تبوک کی طرف چلا کہ اونٹ اور گھوڑے تعداد میں اتنے کم تھے کہ تقریباً بیس سپاہیوں کے لئے ایک اونٹنی تھی رسد و اجناس کی حد درجے کمی تھی۔ پانی راستے میں کم یاب اور اکثر منزلوں میں نایاب تھا سواریوں کے لئے اونٹوں کی کمی کے باوجود ان اونٹوں میں سے بھی کچھ اونٹوں کو ذبح کرنا پڑا تاکہ ان سے پانی حاصل کیا جائے۔ اونٹ ایسا جانور ہے جو کئی کئی دنوں کے لئے اپنے جسم میں پانی ذخیرہ کر لیتا ہے۔ پانی کی اس شدید قلت کو اس بات نے شدید تر بنا دیا کہ مدینۂ منورہ سے تبوک کے سفر میں ایسے مقامات آئے جو مغضوب قوموں کے انجام کی زندہ شہادت کا درجہ رکھتے تھے۔ ان مقامات میں قومِ ثمود کی بستی بھی شامل تھی۔ قومِ ثمود نے پہاڑوں کے جگر تراش کر اپنے سنگین اور مستحکم مکانات تعمیر کئے تھے۔ ان مکانوں کے مضبوط ہونے پر انہیں اتنا یقین تھا کہ زلزلوں اور طوفانوں کو افسانہ سمجھتے تھے مگر جب عذابِ الٰہی نے انہیں آن پکڑا تو خود افسانہ بن کر رہ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہمراہیوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ اس مغضوب علاقے سے استغفار برلب اور بر دل تیزی سے گزر جائیں۔ یہاں آرام کے لئے نہ ٹھہریں اور نہ یہاں کا پانی پئیں۔ پانی کی شدید قلت میں عذابِ الٰہی کی یاد اور اس کا خوف۔ کیا انسانی تاریخ ایسی کوئی دوسری مثالیں پیش کر سکتی ہے؟

تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن قیام فرمایا۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ مدت ایک ماہ تھی۔ رومیوں تک اس لشکر کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ مسلمانوں کے عزم اور ارادوں کو دیکھ کر رومیوں نے پیش قدمی اور اسلام کی سرزمین میں اسلام کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور سرحدوں سے اور پیچھے ہٹ گئے۔ یقیناً اس فیصلے میں معرکۂ موتہ کی یاد بھی شامل ہوگی۔ تین ہزار مسلمانوں نے دو لاکھ فوج کی پیش قدمی کے آگے بند باندھ دیا تھا اور اب تو تیس ہزار مسلمان روم کی سرحد پر صف آرا تھے، پھر ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے۔ اس سے بڑھ کر اور کون سی طاقت مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کر سکتی تھی۔

ان غیر معمولی حالات میں بھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ السلام نے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی تربیت جاری رکھی۔ تبوک میں ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبے کے ہر لفظ اور ہر فقرے کی معنویت چودہ سو سال میں واضح تر ہوگئی اور نئے معانی ہم پر آشکار ہوتے رہیں گے۔ آپ کے عہد سے دوری اگرچہ ہمارے لئے ایک محرومی بھی ہے مگر اس میں ہمارے لئے تسکین کا پہلو یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو پہلو ہم پر روشن ہوئے ہیں وہ بھی آپ

کی رسالت کی ابدیت پر گواہی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ خطبہ ملاحظہ کیجئے:

''اللہ کی کتاب ہر کلام سے بڑھ کر سچی ہے (ابدی صداقتوں کی امین کتاب) اور کلمۂ تقویٰ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد بات ہے۔ ملتِ ابراہیم سب ملتوں سے بہتر ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ اور روشن حیات سب طریقوں سے بہتر ہے۔ اللہ کا ذکر ہر ذکر سے زیادہ صاحبِ شرف ہے۔ قرآن تمام بیانات سے پاکیزہ تر ہے۔ العزم کے کام سب سے بہتر ہیں۔ جو نئی بات نکالی گئی (بدعت) ہمارے کاموں میں بدترین ہے۔ سب سے اچھی روش (اور ارادہ) انبیا کی روش ہے۔ شہدا کی موت موتوں میں سب سے بہتر ہے۔ دل کا بدترین اندھا پن ہدایت کے بعد گمراہی ہے، عملِ نافع اعمال میں سب سے بہتر ہے، جس پر لوگ (آسانی سے) چل سکیں بہترین روش وہ ہی ہے، دل کا اندھا پن بدترین اندھا پن ہے، اوپر والا ہاتھ (دینے والا ہاتھ) نیچے والے ہاتھ (لینے والا) ہاتھ سے بہتر ہے، تھوڑا مگر کافی مال اس بہت سے مال سے بہتر ہے جو انسان کو غفلت میں ڈال دے، جاں کنی کے وقت کی توبہ بدترین توبہ ہے، قیامت کے دن کی ندامت بدترین ندامت ہے، لوگوں میں سے کچھ جمعہ کی نماز کے لئے آتے ہیں مگر ان کے دل پیچھے (دنیا میں) لگے رہتے ہیں، اور بعض لوگ (یوں ہی) کبھی کبھی اللہ کا ذکر کرلیا کرتے ہیں، جھوٹی زبان (جھوٹ) بدترین خطا (گناہ) ہے، بہترین دولت دل کی دولت (اور تونگری) ہے، بہترین توشہ (اور زادِ راہ) تقویٰ ہے، خوفِ الٰہی دانائی کا جوہر ہے، یقین، دل میں جگہ پانے والی بہترین چیز ہے، شک، کفر کی شاخ ہے، بین کرنا، جاہلیت کا کام ہے، چوری (اور دھوکہ) جہنم کی آگ ہے، نشے میں بدمستی آگ میں قیام ہے، (برا اور سفلی جذبات بھڑکانے والا) شعر، ابلیس کا (ترکہ) ہے، شراب گناہوں کا مجموعہ ہے، بدترین روزی یتیم کا مال کھانا ہے، سعادت مند وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے، اصل بدبخت (شقی) وہ ہے جو پیدائشی شقی ہو، عمل کا ماحصل اس کا بہترین انجام ہے، جھوٹا خواب بدترین خواب ہے، جو بات ہونے والی ہے وہ بہت قریب ہے (قیامت یا موت)، مومن کو گالی دینا فسق ہے، مومن کا قتل کفر ہے، مومن کا گوشت کھانا (اس کی غیبت کرنا) اللہ کی نافرمانی اور معصیت ہے، مومن کا مال اسی طرح حرام ہے جیسے اس کا خون، جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑائی اختیار کرے اللہ اسے جھٹلا دیتا ہے، جو دوسروں کی عیب پوشی کرتا ہے اللہ اس کی عیب پوشی کرتا ہے، جو دوسروں کو معاف کرتا ہے اسے معاف کردیا جاتا ہے، جو غصے کو ضبط کرلیتا ہے اللہ اسے اجر دیتا ہے، جو نقصان پر صبر کرتا ہے اللہ اس کے نقصان کی تلافی فرما دیتا ہے، جو چغلی کرتا ہے اور اسے پھیلاتا ہے اللہ اس کو لوگوں میں رسوا کردیتا ہے، جو صبر کرتا ہے اللہ اسے بڑھاتا ہے، جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اللہ اسے عذاب دیتا ہے۔''

اور اس خطبے کے بعد سرورِ دیں اور ہادیٔ سبل نے تین مرتبہ استغفار کیا۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کچھ باتوں میں دوسرے انبیاء پر فضیلت حاصل ہے۔ اور آپ نے ان فضیلتوں کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے جوامع الکلم کا ذکر فرمایا اعطیت بجوامع الکلم ''مجھے جوامع الکلم عطا کیے گئے۔'' راقم الحروف نے جوامع الکلم کے سلسلے میں ایک سلسلۂ مضامین شائع کیا تھا اور اب یہ سلسلہ بہت سے اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوگا۔ حافظ فضل الرحمٰن صاحب بھی جوامع الکلم کا ایک مجموعہ شائع کر چکے ہیں۔ میں نے اپنے سلسلے کو ''قطرے میں سمندر'' کا عنوان دیا تھا۔ لفظ کے ایک قطرے میں سرورِ دو عالم نے معانی کے سمندر پیش کر دیئے۔ خطبۂ تبوک کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوا کہ خطبۂ تبوک، جوامع الکلم کا معجز نما مجموعہ ہے۔ ہر فقرہ ایک بڑے خیال کا جامع ہے۔ متفرق فقرے بھی بڑی بات ہوتے لیکن جوامع الکلم کے خطبات اور الامین صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو میں ان کی کثرت نے انہیں جاودانی معجزہ بنا دیا ہے۔ ''اشرف الحدیث ذکر اللہ''۔ اس کلمے اور دوسرے کئی کلمات کے ترجمے کی بھی ضرورت نہیں۔ عالم اسلام کے ملکوں اور زبانوں میں یہ کلمے مقامی زبانوں سے ہم آہنگ ہو کر خوب سمجھے جاتے ہیں اور ضرب المثل کے درجے پر فائز ہیں۔ ذکرِ الٰہی تمام کلموں اور باتوں سے افضل ہے۔ یہ ذکر ہمارے قلوب کو اطمینان عطا کرتا ہے۔ اسمائے حسنیٰ ذکرِ الٰہی کا وسیلہ ہیں اور یوں یہ ذکر ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کا احاطہ کر لیتا ہے۔ ان کا دائرہ اور تفہیم، ذاکر کے علمی پس منظر کے ساتھ تخلیق وتکوینِ کائنات کی گہرائیوں تک ذاکر کو پہنچا دیتا ہے۔

خیر السنن سنۃ محمد۔ سب طریقوں میں سب سے بہتر طریقہ اور روش محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے۔ ''سنت'' کا لفظ اور اس کی جمع سنن اردو میں مستعمل ہیں۔ ہم ''فرائض وسنن'' سننِ رسول اور سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سننِ موکدہ جیسے الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ سنت کا لفظ روش، طریقِ حیات، دستور کے معانی میں اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ حیات کے علاوہ یہ لفظ اللہ کے دستور، قاعدے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ اللہ کے قانون اور روش دائمی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشِ حیات (آپ کی گفتگو، آپ کی حکمت، آپ کا رہن سہن، آپ کا اندازِ تبلیغ، آپ کے بیان کردہ عبادات کے طریقے وغیرہ وغیرہ) بہترین ہے اور آپؐ کے نمونے کی اتباع میں ہماری حیات اور نجات ہے۔ یہ سب باتیں جنہیں بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور بیان کی جاتی ہیں، اس ایک کلمے میں آ گئی ہیں۔

خیر الغنیٰ، غنیٰ النفس۔ سب سے بہتر تونگری، دل کی تونگری ہے۔ یہ ایک کلمہ نفسِ انسانی اور

حیاتِ انسانی کی ایک بڑی صداقت کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ہم ہر دن دیکھتے ہیں کہ اقتدار کے بھوکے اقتدار کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے، وعدے کرتے ہیں اور انہیں بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے توڑ دیتے ہیں، سیاست دان اپنی سیاسی وفاداریاں بدل دیتے ہیں، اپنے الفاظ کی تاویل لفظ و معانی کے ہر اصول کو توڑ کر کرتے ہیں۔ کوئی رشتہ انہیں اقتدار سے زیادہ عزیز نہیں ہوتا، بھائی کو قتل کرا کے بہن خوش ہوتی ہے کہ اس کی کرسی سلامت رہی۔ سرمایہ دار دولت کے ڈھیر لگاتا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے کہولو کے بیل کی طرح دولت کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ اس کے لئے دولت کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ نہیں ہوتی بلکہ اس کی معبود بن جاتی ہے، اور وہ اس خدائی وعید کو بھول جاتا ہے کہ اسی دولت، اسی سونے اور چاندی سے اس کی پیشانی، اس کے پہلو اور اس کا جسم داغا جائے گا۔ قارون اسی نفسی کیفیت کا ترجمان اور سمبل (Symbol) ہے۔ اخلاقِ نبوی، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا زُہد و تقویٰ اور آپ کا اسوۂ کریمہ، بندۂ مومن کے دل کو ہر دو جہاں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

صدق کی وسعتیں

خطبۂ تبوک حیاتِ مومن کا ایک جامع منشور ہے اور تعلیماتِ قرآن کا خلاصہ ہے۔ غزوۂ تبوک اللہ تعالیٰ پر توکل، اسلام پر جان اور مال کو قربان کرنے اور اسلامی ضابطۂ اخلاق کو اپنانے کے سلسلے میں آزمائشوں کی کامل مثال ہے، خاص طور پر ایک اخلاقی وصف ''صدق'' کی قدر و قیمت اور اہمیت۔ پیچھے رہ جانے والے تین سچے مومنوں کی آزمائش سے اس طرح اُبھر کر آئی کہ آج تقریباً پندرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی یہ مثال سچائی کے راستے اس طرح اجالتی ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کا ذہن اور اس کا وجود روشن ہو جاتا ہے۔ ''صدق'' اور ''امانت''۔ یہ دونوں اوصاف نبوت سے پہلے بھی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت اور آپ کا امتیاز تھے اور نبوت کے بعد تو آپ کے صدق، آپ کے اصحابِ باصفا اور امتیوں کی میراث بن گیا۔ آپ کا چلنا صدق تھا، آپ کا بیٹھنا صدق تھا، آپ کا سونا اور خواب صدق تھا، آپ کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ صدق تھا، آپ کی خاموشی صدق تھی، غرض کہ زندگی کا ہر لمحہ صدق تھا اور اس صدق کو صحابۂ کرام، ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیت نے اس طرح اپنا لیا کہ اُن کی زندگی کے تابندہ لمحے قیامت تک انسانوں کو راستہ دکھاتے رہیں گے۔ سچائی، فلاح اور نجات کا راستہ۔

منافقوں اور عذر تراش دیہاتیوں کے علاوہ تین سچے، مخلص اور اسلام کو اپنی زندگی کا جواز جاننے والے مسلمان بھی غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کر سکے۔ منافقوں اور بہانہ باز اعراب نے غزوۂ تبوک سے

واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے جھوٹے عذر پیش کئے اور مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جھوٹے عذر ''قبول'' فرمالئے۔ ذرا اس اخلاقی بلندی کو تو دیکھئے کہ منافقت کی علامت ''مسجدِ ضرار'' کو تو آگ لگادی گئی لیکن منافقوں کو شرمندہ نہیں کیا گیا۔

یہ تین سچے اور پکے مومن تھے کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم۔ ان تینوں نے کوئی عذر پیش نہیں کیا بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرلیا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن کعب کی ایک طویل روایت موجود ہے جس میں حضرت کعب بن مالک کی کیفیت ان کی زبانی پیش کی گئی ہے۔ ہم اس روایت کو بہت اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ روایت کی تفصیلات ترک کردی گئی ہیں۔

''غزوۂ تبوک کے وقت میری حالت بہت اچھی تھی۔ اللہ گواہ ہے کہ اس سے پہلے میرے پاس کبھی دو سواریاں جمع نہیں ہوئی تھیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی تیاریاں شروع کیں تو ایسے دن تھے جب کھجور پک رہی تھی اور سائے میں بیٹھنا اچھا معلوم ہوتا تھا (میں یہ سوچتا رہا کہ کسی وقت بھی جہاد میں شرکت کی تیاری کرلوں گا کہ ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ اس لشکر کو راستے میں جا پکڑوں گا (کہ کئی دن گزر گئے)۔ اب سب لوگ دور نکل چکے تھے۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ آپ سے جاملوں مگر یہ تقدیر میں نہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد جب میں مدینہ منورہ میں چلتا پھرتا تو مجھے یا تو منافق نظر آتے یا کمزور اور ضعیف۔ مجھے بہت افسوس ہوتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لا رہے تھے تو میں نے سوچا اور خاندان کے لوگوں نے بھی مشورہ دیا کہ کوئی ایسا بہانہ ہاتھ آجائے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصے سے بچ سکوں۔ لیکن جب آپ مدینے کے بالکل قریب آگئے، تو بہانہ سازی کا خیال میرے دل سے نکل گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے آکر مسجد نبوی میں تشریف فرما ہوئے تو پیچھے رہ جانے والے آپ کے پاس آکر عذر پیش کرنے لگے اور آپ قبول کرتے جاتے۔

میں نے حاضر خدمت ہوکر سلام پیش کیا تو آپ نے غصہ آلود تبسم کے ساتھ سلام کا جواب دیا۔ آپ نے میرے پیچھے رہ جانے کا سبب پوچھا تو میں نے کہا کہ اگر آج میں جھوٹ بول کر آپ کو راضی بھی کرلوں تو کل اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے ناراض کردے گا اس لئے میں سچ ہی بولوں گا۔ اللہ کی قسم میں قصوروار ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرا شاہد ہے اسی سے مجھے مغفرت کی امید ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ تم نے صحیح بات بیان کردی۔ اچھا جاؤ اور اپنے

بارے میں اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔ مجھے معلوم ہوا کہ مرارہ بن ربیع اور بلال بن امیہ نے اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا ہے۔ یہ دونوں بدری صحابہ تھے۔ یہ سن کر مجھے سکون حاصل ہوگیا کہ میں ان کا ہم قسمت ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق کوئی ہم سے کلام نہ کرتا۔ یوں محسوس ہوا کہ کوئی ہمیں جانتا نہیں۔ زمین و آسمان بدل گئے۔ میرے دو ہم قسمت تو گھر بیٹھ رہے مگر میں ہمت کر کے مسجدِ نبوی میں نمازِ باجماعت میں شریک ہوتا مگر کوئی مجھ سے بات نہ کرتا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام کرتا تو یوں لگتا جیسے آپ کے ہونٹ ہل رہے ہوں مگر آپ بلند آواز میں جواب نہ دیتے۔ ایک دن میں بازار سے گزر رہا تھا کہ شام سے آنے والا ایک عیسائی تاجر میرے پاس آیا اور اس نے مجھے غسان کے عیسائی بادشاہ کا خط دیا۔ اس نے لکھا تھا کہ تمہارے رسول تمہیں ذلیل کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہیں بڑی عزت سے رکھیں گے۔ میں نے سوچا کہ (اللہ اکبر) اب کافر میرے ایمان کی قیمت لگا رہے ہیں۔ میں نے خط کو ایک تندور کی آگ میں جھونک دیا کہ یہ ہے میرا جواب۔

وہ پچاسواں دن تھا۔ میں فجر کی نماز کے بعد اپنے گھر کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا کہ زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے اور زمین کی وسعت میرے لئے تنگ ہوگئی ہے کہ کوہِ سلع سے بلند ہو کر کسی کی آواز مجھ تک پہنچی کہ کعب تمہیں بشارت دی جاتی ہے۔ اللہ نے تمہاری غلطی معاف کر دی ہے۔ یہ سنتے ہی میں سجدے میں گر گیا۔

اس صبح قرآنِ مجید کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ اور انصار و مہاجرین کے حال پر اپنی توجہ فرمانے کے بیان کے بعد ان ''تینوں'' کو بھی اپنے کرم سے نوازنے کا اعلان فرمایا ہے۔ نوید معافی کی آیت یہ ہے:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَا مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ط ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ط اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ O (۱۹)

اور اللہ نے ان تینوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ ان کی پریشانی کا یہ عالم ہوا کہ زمین اپنی فراخی و وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہونے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آگئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کی پکڑ سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے اس وقت وہ خاص توجہ کے قابل ہوئے۔ بیشک اللہ بہت توجہ فرمانے ولا (توبہ قبول کرنے والا) اور بہت رحیم ہے۔

ان آیاتِ ربانی کی صداقت، تینوں سچے مسلمانوں نے دیکھ لی جو پیچھے رہ گئے تھے۔ کعب بن مالک،

مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ جن سے پچاس دنوں تک کسی ساتھی، کسی دوست اور کسی عزیز نے بات تک نہیں کی تھی، اور چالیس دنوں کے بعد جن کی بیویوں کو ان سے الگ رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان تینوں کی زندگی کو جس مقاطعے کا واسطہ پڑا اس کی کوئی مثال شاید انسان کی طویل تاریخ میں نہیں ملتی اور جب اللہ تعالیٰ کے حضور ان کے سجدے، اس کی فریاد اور ان کا رجوع ہونا قبول ہو گیا تو زندگی یکسر بدل گئی۔ مدینے کے سارے مومنوں کے چہرے کھل اٹھے، ہر ایک کا رخ انہی تینوں کے گھروں کی طرف تھا۔ مسلمان ان تینوں کو اور ایک دوسرے کو تحفے دے رہے تھے۔ عیدین کے علاوہ ایسا جشن مدینے کی فضاؤں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس عظیم واقعے سے کردار اور معاشرے کی تعمیر میں صدق کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ انسانی اخلاق میں صدق اولین صفت ہے اور اس کے بعد ہی دوسری اخلاقی صفات آتی ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان میں بیشتر صدق سے ہم رشتہ ہیں اور اس کا ثمرہ یا نتیجہ ہیں۔ صدق قول تک محدود نہیں بلکہ عمل کی دنیا بھی بدل دیتا ہے اور کون سا انسانی عمل ایسا ہے جو صدق سے الگ ہو کر کوئی اہمیت یا معنویت رکھتا ہو۔ معاملات کی دنیا کی اساس صدق پر ہے۔ رشتوں میں صدق نہ ہو تو مقدس اور قریب ترین رشتے بھی محض لفظ بن جاتے ہیں۔ صدق اخلاقِ الٰہی کا حصہ ہے اور اس نے اپنے کرم سے انسان کو بھی یہ علوی رنگ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

اللہ کا قول سچا ہے، اللہ کے وعدے سچ ہیں، وہ اللہ ہی ہے جو اپنے رسولوں کے خواب کو سچا کر دکھاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ساتھ خانۂ کعبہ کے طواف کا جو خواب دیکھا اس کی تعبیر صلحِ حدیبیہ کے بعد عمرۃ القضا کی صورت میں سامنے آئی، اللہ نے رسول اور مسلمانوں سے اسلام کی نصرت کا جو وعدہ کیا وہ مختلف صورتوں میں مختلف مواقع پر متشکل ہوا۔ کبھی فرشتوں کے نزول کی صورت میں، کبھی مسلمانوں کی بے مثال پامردی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی فتح کی شکل میں اور کبھی مسلمانوں کے اکھڑتے ہوئے قدموں کو پہاڑوں جیسی استقامت عطا کر کے۔ اس دنیا کے معاملات کے علاوہ ہمارے اعتقادات کی دنیا کے بعض عقیدوں اور صداقتوں کا تعلق اللہ کے صدق سے ہے۔ قیامت کے برپا ہونے اور یومِ حساب کی صداقت پر ہمارے اسلام کی بنیاد قائم ہے کیونکہ اس کا رشتہ اللہ پر ایمان اور زندگی کے تسلسل پر یقین سے ہے۔ ہمارے دور کے علوم میں مستقبلیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس علم کی بنیاد اسلام نے رکھی۔ آنے والی زندگی پر ہمارا ایمان اتنا ہی مستحکم ہے کہ اچھا مسلمان اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے آنے والی دنیا اور زندگی کو دیکھ لیتا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا O (۲۰)

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ (اور کوئی شک) نہیں اور اللہ سے زیادہ سچی بات کہنے والا اور کون ہوگا (اور کون ہوسکتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کے اس صدق کو عالمِ انسانی میں انبیائے کرام علیہم السلام اجمعین نے پھیلایا اور اپنی مثال سے انسانوں کو بتایا کہ قول و عمل اور معاملات میں صدق کے دائرے کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں، صدق کے امکانات کتنے وسیع ہیں اور صدق کس طرح مومن اور کافر کے درمیان خطِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت کعب بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں نے صدق کی خاطر جس طرح معاشرے میں تنہائی کے عذاب کو جھیلا اور پھر صدق ہی نے انہیں مدینۂ منورہ کے معاشرے میں ہر نظر کا محبوبِ نظر بنا دیا اور وہ صبح کتنی درخشاں ہوگی جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نظریں تینوں کے چہروں پر پڑی ہوں گی اور دیدۂ مصطفیٰ ان کے سچ کی روشنی کا گواہ بنا ہوگا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کے عمل اور زندگی کو دیکھ کر فرشتوں کے سامنے انبساط محسوس کرتا ہے، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صدقِ رسول کو اپنے صحابہ میں منتقل ہوتے ہوئے دیکھ کر کس درجہ کی مسرت حاصل ہوئی ہوگی۔

یہ صدق، کذب اور منافقت کے نشان مسجد ضرار کے انجام کے سامنے اور چمک اٹھا۔ یہ مسجد منافقوں نے اسلام کو ضرر پہنچانے کے لئے تعمیر کی تھی تاکہ یہ دارالاسلام میں کفر کی حمایت کا گڑھ بن سکے۔ منافقوں نے چاہا کہ تبوک جاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مسجد میں نماز ادا کرلیں تاکہ اسے ''تقدس'' حاصل ہو سکے اور مسلمان ان کے مکر اور سازش کا شکار ہوسکیں مگر نورِ نبوت سے بے خبر منافقوں کو کیسے یہ بات معلوم ہوسکتی تھی کہ رسول، اللہ کے نور سے چیزوں اور انسانوں کو دیکھتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تبوک سے واپسی پر دیکھا جائے گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو وحیٔ الٰہی نے منافقوں کی چال اور سازش کا پردہ چاک کر دیا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (۱۹)

اور ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے ایک مسجد (مسلمانوں کو) ضرر پہنچانے کے لئے بنائی ہے، کفر (کو تقویت پہنچانے) کی غرض سے اور مومنوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے اور اس غرض سے کہ جو شخص اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکا ہے

اس کے لئے کمین گاہ کا کام کرے۔ اور یہ لوگ قسم کھائیں گے کہ ہمارا مقصد سوائے بھلائی کے کچھ اور نہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

جس شخص کی طرف اس آیتِ مبارکہ میں اشارہ ہے وہ ابو عامر راہب تھا جس کا تعلق بنی خزرج سے تھا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ''جنگ'' کی شہادت قرآنِ کریم نے دی ہے۔ وہ مدینۂ منورہ کے منافقوں اور یہودیوں کا دماغ تھا۔ وہ دماغ جو ہر وقت اسلام کے خلاف منصوبے بناتا رہتا۔ اس کے مکۂ معظمہ کے مشرکین سے گہرے روابط تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ قیصرِ روم سے اس کے تعلقات اسلام دشمنی کی بنیادوں پر استوار تھے۔ یہ شخص اسلام کے خلاف ان قوتوں کے اتحاد سے ایک ''گرینڈ اسٹریجی'' (عظیم حکمتِ عملی) وضع کر رہا تھا اور مسجدِ ضرار کو اس اسٹریجی کا مرکز بنانا مقصد تھا، لیکن ربِ جلیل کی حکمت اور تدبیر کے آگے منافقوں اور کافروں کا مکر تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ بودا ہوتا ہے۔ آخر وحیٔ الٰہی کی روشنی میں اس مسجد کو ڈھا دیا گیا اور اس کو آگ لگا دی گئی۔ مسجدِ ضرار کی مثال سے یہ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ اسلام کے خلاف بعض سازشیں بہت مقدس نقابوں میں ملفوف ہو کر ہمارے سامنے آسکتی ہیں اور دانشِ ایمانی کا تقاضا ہے کہ ہم ایسی ہر سازش سے باخبر رہیں۔ یہ سازشیں ''جہاد'' کے مقدس نام کا سہارا لے کر پروان چڑھ سکتی ہیں یا اسلام کے خلاف سازش کو اعتدال پسندی اور روشن خیالی اور کی خوبصورت اصطلاحات کے نام پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ

الفاظ کے پھندے میں الجھتا نہیں ''مومن''

مغرب کے مسیحی اور یہودی منصوبہ ساز شدت سے یہ گھناؤنا کھیل، کھیل رہے ہیں اور اب اس میں مسلمان ملکوں کے حکم راں اور دانش فروش (نام نہاد دانش ور) بھی شامل ہو گئے ہیں۔ دانشِ نورانی اسلامی اخلاق کا ایک جز ہے جس کی مدد سے ایسی سازشوں کو ختم کیا گیا ہے اور کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔

اسلام کی فتحِ مبین۔ فتح مکہ

صلحِ حدیبیہ کے موقع پر سورۂ الفتح نازل ہوئی تھی۔ یہ مومنوں کے لئے سورۂ سکینہ تھی جو صلحِ حدیبیہ کو اپنی ''پسپائی'' سمجھ کر بددل ہو گئے تھے۔ ان حوصلہ شکن حالات میں خالقِ ارض وسما اور خیرِ مطلق نے مسلمانوں کو فتح کی نوید سے حوصلہ بخشا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ واقعات نے اپنی معنویت کو مسلمانوں پر اور دنیا پر آشکار کرنا شروع کیا اور وہ بات جو واضح تھی، واضح تر ہوگئی کہ قرآنِ کریم اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے وعدے، اس کی پیشین گوئیاں، اس کی تنذیر، یہ سب علمِ الٰہی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔

انا فتحنا لك فتحاً مبينا ایک معرکے میں مسلمانوں کی فتح کی خبر نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کی فتح کی نوید ہے۔ اس فتحِ مبین کا سلسلہ صلحِ حدیبیہ سے شروع ہوا، اسی فتح کے اگلے مرحلے کا نام فتحِ خیبر ہے۔ یہ فتحِ قریب، صلح حدیبیہ کا ضمیمہ تھی، اسی لئے اس میں صرف اصحابِ بیعتِ رضوان کو شرکت کی اجازت دی گئی اور فتحِ مکہ اسی فتحِ مبین کا تکملہ تھی کیونکہ اس کا رشتہ صلحِ حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط اور صلح کی ایک دفعہ کی خلاف ورزی سے ہے۔ صلحِ حدیبیہ کی شرائط کے مطابق قبائلِ عرب کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریشِ مکہ میں سے جس کے چاہیں حلیف بن سکتے ہیں۔ بنو بکر قریش کے ساتھ شریکِ عہد ہو گئے اور بنو خزاعہ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستگی کو چُن لیا۔ ان دونوں قبائل کے درمیان عرصۂ دراز سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ بنو بکر نے اپنے غلط اندازوں کے مطابق قریش کے ساتھ اپنے عہد کو بنو خزاعہ سے بدلہ لینے کا موقع سمجھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ مسلمان ان کی اور قریش اور دوسرے حلیف قبائل کے خوف سے بنو خزاعہ کی مدد سے گریز کریں گے۔ ان کے اس قیاس کی وجہ شاید صلح نامۂ حدیبیہ کی تحریر کے وقت سہیل بن عمرو کے بیٹے حضرت ابو جندل کا واقعہ ہوگا۔ ابو جندل رضی اللہ عنہٗ مسلمان ہو گئے تھے اور سہیل نے انہیں بیڑیاں پہنا کر زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ حضرت ابو جندل کسی طرح حدیبیہ پہنچ گئے۔ سہیل نے کہا کہ معاہدے کے مطابق ہمارے آدمی کو ہمارے حوالے کر دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی صلح نامہ پر دستخط نہیں ہوئے ہیں اور صلح نامہ مکمل نہیں ہوا ہے، مگر سہیل نے کہا کہ بصورت دیگر معاہدے کو منسوخ سمجھا جائے۔ مسلمانوں کے لئے یہ بات سخت ناگوار تھی۔ مسلمانوں کے دل تو ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ وہ ایک مسلمان کی اسیری اور اس پر جبر کے مقابل کسی صلح پر تیار نہ تھے۔ مسلمانوں کے جذبات ان کے تیور اور چہرے سے آشکار تھے، مگر اللہ کے نور میں واقعات کو دیکھنے والے رسول نے سہیل کی بات مان لی اور ابو جندل سے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں۔ اللہ تمہارے لئے کوئی صورت پیدا کر دے گا۔ سہیل نے ابو جندل رضی اللہ عنہ کے چہرے پر کیکر کی ایک شاخ توڑ کر ضرب لگائی۔ اس پر مسلمان رونے لگے۔ یہ ضرب ابو جندل کے چہرے پر نہیں لگی تھی بلکہ بیعتِ رضوان میں شریک ہر فرد نے اس کی اذیت اپنے چہرے پر محسوس کی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام اور آپؐ کے حق پر ہونے کے یقین نے انہیں خاموش کر دیا تھا۔ نظم وضبط اور اطاعتِ رسول اخلاقی صفت ہی نہیں بلکہ ایمان کا حصہ ہے۔

صلح حدیبیہ کے غالباً اسی واقعے نے بنی بکر کو بنی خزاعہ پر حملہ کرنے کی جرأت عطا کی۔

مسلمان اپنے عہد و پیمان کی حد درجہ پاس داری کرتے تھے۔ صلح نامہ پر دستخط تو نہیں ہوئے تھے مگر دفعاتِ صلح پر فریقین کا اتفاق ہو چکا تھا اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو جندل کو صبر کی تلقین

فرمائی اور شرائطِ صلح کا احترام فرمایا۔ صلح حدیبیہ شرائط نامہ کی شرائط کی ایسی پاس داری کو، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، بنی بکر نے مسلمانوں کی کمزوری سمجھتے ہوئے ان کے حلیف بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ بنوخزاعہ قتیر نامی مقام پر آباد تھے۔ بنوبکر نے ان کے مسکن پر شب خون مارا۔ کئی آدمی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس حملے میں قریش کے چند سربرآوردہ افراد بھی شریک تھے اور قریش نے بنوبکر کو اسلحہ بھی مہیا کیا۔ بنوخزاعہ نے حرم میں پناہ لی مگر بنوبکر نے حرم کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے وہاں بھی بنوخزاعہ کے افراد کو قتل کیا۔ اس عہد شکنی کے واقعے اور ہنگامے کے بعد عمر بن سالم خزاعی اور اس کے ساتھیوں نے رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی اور سارے واقعے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور عرض کیا کہ معاہدے کے مطابق ہماری مدد فرمائی جائے۔ معاہدے اور عہد و پیمان کو پورا کرنا تو اسلامی اخلاق کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اسے مسلمانوں کی شناخت قرار دیا ہے اور اس کی فرضیت کو آشکار کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں ایفائے عہد کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ سورۃ المائدہ کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۲۲)

اے ایمان والو اپنے عہد و پیمان پورے کرو

قرآن کریم ایک زندہ اور جاوداں معجزہ ہے۔ اس کا ہر لفظ ایک جہانِ معانی اپنے دامن میں رکھتا ہے اور اس کا ترجمہ ناممکن ہے، ہاں اس کے مفاہم کی ترجمانی اللہ کی مدد سے کی جاسکتی ہے۔ عقد کے معانی میں پختہ عہد و پیمان کا معنی شامل ہے۔ عہد کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں عہدِ الست بھی شامل ہے۔ وہ عہدِ بندگی جو ساری انسانی ارواح نے اپنے رب سے کیا تھا۔ اس کے معانی میں احکامِ الٰہی بھی شامل ہیں جو کو پورا کرنے اور پیروی کرنے کے عہد کا دوسرا نام ایمان ہے اور اس میں وہ تمام عہد اور معاہدے شامل ہیں جو انسان ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ ہر شریف قوم اور انسان کو ان معاہدوں کی پابندی کرنی چاہئے، مگر اہلِ ایمان کو تو اس کا حکم دیا گیا ہے اور اللہ کے ہر حکم کی بجا آوری دائرہ ایمان میں داخل ہے۔ عقد کے لفظی معنی کے مطابق عقد (جمع عقود) وہ بندش ہے جس کے اہلِ ایمان پابند ہوتے ہیں اور یہ پابندی وہ اپنی جان کی قیمت پر بھی پوری کرتے ہیں۔ عہد کی پابندی، ایمان کی بنیادی شرائط سے ایک ہے اور اسے پورا کئے بغیر کوئی مسلمان، محسن اور متقی کے درجے پر فائز نہیں ہوسکتا۔ سورۃ البقرہ میں نہایت وسیع پس منظر میں مسلمانوں کی دوسری اخلاقی صفات کے ساتھ پابندیٔ عہد کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری صفات ہم رشتہ ہیں اور ان ساری صفات کی نمود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات

میں اس طرح ہوئی ہے کہ وہ ابدی طور پر اسوۂ حسنہ کی صورت میں اہلِ ایمان کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (۲۳)

ساری نیکی مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینے میں نہیں بلکہ حقیقی نیکی تو اس شخص میں ہے جو اللہ پر، یومِ قیامت پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب (کتابوں) پر اور انبیاء پر ایمان لایا، اور جو مال سے محبت کے باوجود اہلِ قرابت، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے، اور جو اپنی دولت غلاموں کو آزاد کرنے پر صرف کرے، اور نماز کو قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور جب (کسی سے کوئی) عہد کرے تو اسے پورا کرے اور تنگ دستی اور تکلیف میں اور جنگ کے ہنگام پر صبر کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کو اختیار کیا اور جو متقی ہیں۔

اس آیتِ شریفہ نے اس حقیقت کو نکھار کر پیش کر دیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ جو اپنے اپنے قبلے کو بڑی اہمیت دے رہے تھے اس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں تھا اور بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنانا بھی دوسری اہم مصلحتوں کی بنا پر تھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب امامتِ اقوام حضرت اسماعیل کی نسل کے رسولِ آخر کے توسط سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ اب قبلہ تو امت کی یک جہتی کا نشان ہے ورنہ اصل اہمیت تو ایمان، عقائد، اخلاق اور معاملات کو حاصل ہے، اور پھر ربِ جلیل نے ان ایمانی اور اخلاقی صفات کو بیان کیا ہے تو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان صفات میں ایفائے عہد کو اتنی بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس کا ذکر کیا گیا ہے، ایفائے عہد کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اخلاقِ حسنہ کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انہیں عہدوں میں عہدِ رضوان بھی شامل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ غالب و کارآفریں پر جن لوگوں نے بیعت کی اور حق کی سربلندی کے لئے جان قربان کرنے کا عہد کیا ان کے حق میں فرمایا گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۗ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ (۲۴)

وہ لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ پس جو شخص عہد شکنی کرے، دراصل وہ اپنے نفس (اور اپنی ذات) سے عہد شکنی کرتا ہے اور جو اپنے اس عہد کو پورا کرے جو اس نے اللہ کے ساتھ کیا ہے۔ اللہ عن قریب اسے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

اس آیت میں عہد اور ایفائے عہد کو شخصی اخلاق کے ساتھ ساتھ اجتماعی اخلاق کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ معاشرہ تشکیل فرمایا کہ آپ کا اخلاق معاشرے کے افراد اور پورے معاشرے میں جھلک اٹھا ہے۔

عمرو بن سالم کی فریاد اور امداد طلبی کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے تاب ہو گئے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپؐ نے فرمایا نُصِرتَ نُصِرتَ۔ تیری مدد کی گئی، تیری مدد کی گئی، آپؐ کے ان الفاظ نے قریش کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ یہ رب جلیل کا فیصلہ تھا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا۔

بنو خزاعہ کا وفد مطمئن ہو کر لوٹ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ خاموشی کے ساتھ سفر کا سامان درست کر دیں۔ ادھر قریش مکہ کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا، انہوں نے مجلسِ مشاورت منعقد کی کہ کس طرح معاہدے کی خلاف ورزی کا ازالہ کیا جائے۔ انہوں نے ابوسفیان کو تجدیدِ معاہدہ کے لئے مدینہ منورہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دشمنوں کو بھی اس بات کا پختہ یقین تھا کہ سفیر اور ایلچی مسلمانوں کے درمیان محفوظ رہیں گے خواہ حالات کتنے ہی سنگین ہوں۔ ابوسفیان مدینہ منورہ آئے اور ناکام لوٹ گئے، اس سفر کے ایک واقعے کا ذکر ضروری ہے کہ وہ اخلاق و طرزِ مومن کی زندگی کا ایک باب ہے۔ ابوسفیان مدینہ منورہ پہنچتے ہی اپنی بیٹی حضرتِ ام حبیبہ کے مکان میں آئے اور بستر پر بیٹھنا چاہا مگر ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بستر ان کے نیچے سے گھسیٹ لیا اور کہا کہ یہ اللہ کے پاک نبی کا بستر ہے اور آپ کافر اور نجس ہیں اس لئے اس بستر پر نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ چھوٹا سا واقعہ اخلاقی، ایمانی اور انسانی سطحوں پر کتنا تہ دار اور بامعنی ہے۔ اصل طہارت خوبصورت اور صاف ستھرے لباس سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ پاکیزگی ایمان، عملِ صالحہ اور عمومی رویے کا نام ہے۔ پھر ایمانی سطح پر یہ بات سامنے آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ ایمان کو اپنے ماں باپ، اولاد، سارے انسانوں بلکہ اپنی ذات سے بھی عزیز ہوتے ہیں اور اس کے بغیر کسی کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی اور انسانی سطح پر یہ بات ہم پر واضح ہوتی ہے کہ جب ایسا کوئی معاملہ پیش ہو تو جھوٹا اخلاق اور حسنِ تکلم ایمان کے منافی ہے اور یہی حقیقی اخلاق ہے کہ اس کی بنیاد صدق ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو عسکری تیاری کا حکم دیتے ہوئے انہیں بتادیا کہ مکہ معظمہ پر فوج کشی کا ارادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے دعا کی کہ اہل مکہ کو آپ کے عزم اور اقدام کا علم نہ ہونے پائے اور آپ ان کے باخبر ہونے سے پہلے ان کے سر پر جا پہنچیں۔ عسکری تدبیر کے طور پر آپ نے رمضان ۸ھ کے آغاز پر چند صحابیوں کا ایک دستہ بطن اضم کی طرف بھیجا۔ قرب و جوار کے علاقوں میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس علاقے کا رخ کرنے والے ہیں۔ ادھر یہ خبریں گشت کر رہی تھیں اور ادھر اسلامی لشکر اپنے سپہ سالار اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مکۂ معظمہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ رب العزت نے اپنے رسول کی دعا قبول کی اور اہلِ مکہ کو دس ہزار صحابیوں پر مشتمل اس لشکر کے سفر اور ارادوں کی خبر نہ ہوسکی۔ جحفہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ ملے جو اپنے خاندان کے ساتھ مدینۂ منورہ کی طرف گامزن تھے۔ پھر ابواء کے مقام پر ابوسفیان بن حارث اور عبداللہ بن امیہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد اور پھوپھی زاد بھائی تھے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت اذیتیں پہنچائی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ اس پر حضرتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ قریبی رشتہ سے آپ کے بھائی ہیں اور رحمۃ للعالمین کی شفقت کے مستحق ہیں۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دونوں کو سمجھا دیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پہنچ کر وہی کہنا جو حضرتِ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان سے معافی کی درخواست کرتے ہوئے کہا تھا۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ O (۲۵)

اللہ کی قسم! اللہ نے تمہیں ہم پر برتری عطا کی اور سچ ہے کہ ہم ہی خطاوار تھے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور آپ نے اپنے دونوں بھائیوں کو وہی جواب دیا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو دیا تھا۔

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ O (۲۶)

آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت کرے، تمہیں معاف کرے۔ وہی رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔

ہر نبی نے مکارم اخلاق کو عملی مثال سے اپنی قوم کے سامنے پیش کرلیا اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم تو مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوئے تھے، اس طرح کہ آپ کا اسوہ ہر دور کے انسانوں کے لئے ایک مثال کے طور پر زندہ رہے۔ تمام انبیا آپ کے اخلاق اور اسوۂ حسنہ کے تدریجی مراحل کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو درگزر اور حضرت یوسف علیہ السلام کی شانِ کریمی میں حد درجہ مماثلت ملتی ہے اور لاتثریب علیکم الیوم کی کئی موقعوں پر تکرار انسانی تاریخ کے تسلسل کی ایک شہادت ہے اور یوں اللہ تعالیٰ نے آپ کی مثال سے حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر کو بھی اور رفعت عطا کی ہے۔

اسلامی لشکر ام القریٰ کی طرف تیزی سے بڑھتا رہا اور ربِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامیوں کی پیش قدمی کی خبروں کو قریش مکہ تک پہنچنے سے روکے رکھا یہاں تک کہ یہ قافلۂ نو بہار وادیٔ فاطمہ میں پہنچ گیا۔ یہاں اسلامی لشکر نے پڑاؤ کیا۔ خیمے ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر لگائے گئے اور جب ان ہزاروں خیموں میں مشعلیں روشن کی گئیں اور کھانا پکانے کے لئے چولہے جلائے گئے تو مرالظہران، وادیٔ فاطمہ میں چراغاں پیدا ہوگیا اور اس چراغاں میں اہلِ ایمان کے چہروں اور دلوں کی روشنی بھی شامل تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہرے کے انصرام وانتظام پر مامور فرمایا۔

بنوخزاعہ کے قتل عام کے بعد اور مدینہ منورہ سے ابوسفیان کی ناکام واپسی کے بعد سے قریش بہت پریشان تھے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جیش کی مکہ معظمہ کی طرف پیش قدمی کی خبروں کو پہنچنے سے روک رکھا تھا مگر وہ راتوں کو مکہ معظمہ کی حدود سے نکل کر حفاظتی گشت لگانے لگے تھے۔ اس رات بھی ابوسفیان اور بدیل بن ورقا مکہ معظمہ سے باہر نکلے تو انہوں نے مرالظہران میں روشنیوں کا شہر دیکھا۔ ابوسفیان اور بدیل ایک دوسرے سے بات کرنے لگے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ خیموں کی اتنی بڑی بستی اچانک کیسے وجود میں آگئی۔ ادھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید خچر پر گشت کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ انہوں نے ابوسفیان کی آواز سن کر اسے آواز دی کہ ابوحنظلہ! تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ ابوسفیان نے بھونچکے ہو کر کہا کہ ابوالفضل تم یہاں؟۔ حضرت عباس نے ابوسفیان اور بدیل کے قریب پہنچ کر کہا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر ہے اور یہ تمہاری عہد شکنی اور بنوخزاعہ کی فریاد کا جواب ہے۔ ابوسفیان نے گھبرا کر کہا کہ اب کیا ہوگا؟ ہائے ہماری شامتِ اعمال۔ حضرت عباس نے فرمایا کہ پہرہ چوکی کا انتظام عمر کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے تمہیں پالیا تو گردن ماردیں گے۔ اپنے ساتھیوں کو واپس بھیج دو اور میرے پیچھے خچر پر بیٹھ جاؤ۔ حضرت عمر نے ابوسفیان کو دیکھ لیا اور ان کی گردن مارنے کے لئے بے تاب ہوگئے۔ حضرت عباس نے خچر کو ایڑ لگائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ مختصراً بات بتائی اور کہا کہ میں نے ابوسفیان کو پناہ دے دی ہے اور اسلام کی سطوت دیکھ کر اس کو بازی ہار جانے کا یقین ہوگیا ہے۔ عمر نے بھی دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر ابوسفیان کے قتل کی اجازت

مانگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس سے فرمایا کہ ابوسفیان کو اپنے خیمے میں لے جاؤ صبح کو لانا۔ یوں حضرت عمر کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ جب فجر کے وقت ابوسفیان خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تو آقائے نام دار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوسفیان! کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم جان لو کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں۔ یہ چھوٹا سا جملہ اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا دشمن جاں بخشی کے لئے دربار میں حاضر ہے لیکن آپ اس صورتِ حال پر کوئی تبصرہ نہیں فرماتے۔ اس وقت بھی آپ نے ایسا بلیغ جملہ ارشاد فرمایا جو تبلیغ و دعوت کی پوری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ہارے ہوئے جرنیل کو آپ کوئی طعنہ نہیں دیتے بلکہ توحید کی طرف بلاتے ہیں اور اس صورتِ حال کو توحید اور اللہ کے معبودِ مطلق ہونے کی دلیل کے طور پر پیش فرماتے ہیں۔ ابوسفیان نے جو جواب دیا وہ آپ کے اخلاقِ کریمانہ پر بے ساختہ تبصرہ بھی ہے اور معبودانِ باطل سے یک گونہ انکار اور مایوسی کا اظہار بھی۔ ابوسفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ کتنے کریم ہیں اور صلہ رحمی کا آپ کو کتنا پاس ہے۔ اگر اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود ہوتا تو آج اپنے پرستاروں کے کام آتا۔ توحید کے اقرار کے بعد اب اقرارِ رسالت کا مرحلہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حد درجے حلیمی کے ساتھ فرمایا ''ابوسفیان! تم پر افسوس۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم جان سکو کہ میں اللہ کا رسول ہوں''۔ اس مرحلے پر ابوسفیان کی سچائی کی داد دینی ہوگی۔ اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ اس کے جواب پر منحصر تھا۔ اس نے کہا ''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ اس بارے میں مجھے پوری طرح جمعیتِ خاطر ابھی حاصل نہیں ہے''۔ اس جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کریمی، شانِ رسالت اور بردباری پر ایک دشمن کی شہادت اور یقینِ کامل بھی شامل ہے اور یہ نکتہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اسلام کسی بھی مرحلے پر تلوار کے ذریعے نہیں پھیلا۔ اسلام اللہ اور رسول کی حقانیت پر دل و نظر کی شہادت کا نام ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کے تذبذب کے جواب میں اسلام اور کفر کی مسلسل جنگ کے حوالے سے یہ نکتہ واضح کیا کہ اللہ نے تم لوگوں کی ساری سازشوں اور تدبیروں کو کس طرح الٹ دیا اور آج تم جنگ کے بغیر کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہو۔ کیا اب بھی تمہارا تذبذب باقی ہے؟ ابوحنظلہ یہی وقت ہے کہ اللہ اور رسول کی حقانیت کا اعلان کر دو ورنہ حالتِ کفر میں مر گئے تو عذابِ آخرت تمہارا مقدر بنے گا اور یہ عذاب دائمی ہوگا۔ آخر ابوسفیان نے کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

حضرت عباس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ''اے اللہ کے رسول! ابوسفیان کا اسلام لانا فتحِ مکہ کا دیباچہ ہے۔ ابوسفیان جاہ پسند اور خود پرست رہا ہے اس کی تالیف قلب کے لئے کچھ کرنا

مناسب ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ اعلان کر دیا جائے کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کے لئے امان ہے، جو بیت الحرام میں پناہ لے گا اس کے لئے امان ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند رکھے گا وہ مامون رہے گا۔

امان کے اس اعلان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابوسفیان کے گھر کو دارالامان قرار دینا کوئی سیاسی مصلحت نہیں تھی۔ اس میں ابوسفیان کے اکرام کے ساتھ ساتھ مسجد الحرام اور بیت اللہ کی حرمت کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اسلام امن کا دین ہے اور مسجد الحرام اور بیت اللہ اس کا قائم رہنے والا نشان ہے جو اس میں داخل ہوا اس نے امن پالیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ عام آدمی کی جان کا یہ احترام دیکھئے کہ جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا اسے امن مل گیا۔ یہ ایک بستی میں ایک رسول کا فاتحانہ داخلہ تھا۔ سورۃ النمل میں ملکۂ سبا کی زبان سے اس تاریخی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ جس بستی میں بادشاہ فاتح کے طور پر داخل ہوتے ہیں اس میں شریفوں اور عزت داروں کی آبرو خاک میں مل جاتی ہے لیکن ایک رسول جب کسی شہر میں فاتح کے طور پر داخل ہوتا ہے تو اس شان سے کہ اس سر جھکا ہوتا ہے، اس کے لب پر اللہ کے شکر کے کلمات جاری ہوتے ہیں اور وہ مفتوحین کے چہروں پر نگاہ نہیں کرتا کہ انہیں اپنی شکست اور ذلت کا احساس نہ ہو۔

۱۷ رمضان ۸ھ کی صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جیش اسلام مکۂ معظمہ میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ سارے اسلامی قبائل کی فوجیں نہایت منظم تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابوسفیان کو لے کر پہاڑ کے اس ناکے کے قریب کھڑے ہو گئے جہاں سے مسلمانوں کے فوجی دستوں کو گزرنا تھا۔ مختلف قبائل اپنے اپنے پرچموں کے ساتھ اس تنگنائے سے گزرنے لگے۔ پہاڑ کے پیچ وخم سے گزرنے والے فوجی ویسے بھی بہت پروقار معلوم ہوتے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی تند رو ندی بلند و پست کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے گزر رہی ہو۔ سپاہیوں کے ہتھیار سورج کی کرنوں میں چمک رہے تھے۔ خود اور زرہ بکتریں قوت کا اظہار کر رہی تھیں اور رنگ برنگے پرچم کثرت میں وحدت کی علامت تھے۔ جس جس قبیلے کا لشکر سامنے سے گزرتا حضرت عباس ابوسفیان کو بتاتے جاتے۔ ابوحنظلہ! دیکھو یہ بنوسلیم کے جاں باز ہیں۔ اور دیکھو مزینہ کے جوان تمہارے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ ابوسفیان جو کتنے ہی معرکوں کا سالار رہا تھا حیرت اور دبے ہوئے خوف کے ساتھ اس دبدبۂ اسلامی کا مشاہدہ کرتا رہا یہاں تک کہ نبی اکرم علیہ السلام والصلوٰۃ انصار و مہاجرین کے جلو میں سامنے آئے۔ ابوسفیان کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ آج زمین پر کون ہے جو محمد کے مقابل آسکے۔ اس کے خیال اور تصور میں اُحد کے لمحات آ گئے ہوں گے جب اس کی آواز گونج رہی تھی۔ عمر کہاں ہیں؟ ابو

بکر کہاں ہیں اور محمد کہاں ہیں اور صحابہ کی خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے نعرہ لگایا تھا کہ ہبل کی جے ہو اور اس کے جواب میں صحابۂ کرام نے اللہ کی عظمت اور اور سربلندی کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ۱۷ر رمضان ۸ھ کی اس صبح اس منظر کو دیکھ کر ابوسفیان نے کہا عباس! تمہارے بھتیجے کی بادشاہت کے کیا کہنے۔ کیسی مستحکم بادشاہی ہے محمدؐ کی۔ حضرت عباس نے جواب دیا ابوسفیان! اب تو سمجھ لو یہ بادشاہت کا جلوہ نہیں، نبوت کی سطوت ہے۔ نبوت کے سر پر اللہ تعالیٰ کے جلال کا سایہ ہے۔

دس ہزار افراد کے لشکرِ اسلام میں جدید الاسلام بھی تھے، اس کے باوجود فیضانِ نبوت نے بیشتر لوگوں کو تنظیم کے سانچے میں ڈھال دیا تھا، لیکن مسلمانوں پر قریش کے مظالم بہت سے ذہنوں میں تازہ تھے۔ ان میں مہاجر بھی شامل تھے اور انصار بھی۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ انصار کے پرچم بردار تھے اور جب انصار کا دستہ ابوسفیان کے سامنے سے گزرا تو حضرت سعد کے ہونٹوں پر یہ بول آ ہی گئے۔

الیوم یوم الملحمة الیوم تستحل الحرمة

آج کا دن خوں ریزی کا دن ہے۔ آج ہر حرمت حلال ہو جائے گی۔

ابوسفیان نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معاملہ کہہ سنایا اور حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے خدشات کا اظہار نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کا وہ دن ہے جس میں کعبے کی حقیقی تعظیم کی جائے گی۔ اس ایک جملے سے فتح مکہ کی حقیقی غایت آئینہ ہوگئی ہے۔ یہ کسی کی شخصی فتح نہیں ہوئی۔ رب ذوالجلال نے اپنے رسولِ برحق کے ہاتھوں ان کے جدِ مکرم حضرت ابراہیم کے تعمیر کردہ بیت اللہ کی تعظیم قائم کردی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انصار کا پرچم حضرت سعد بن عبادہ کے صاحب زادے کے سپرد کر دیا گیا۔ اخلاقِ حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ میں اپنے ساتھیوں کی دل دہی اور ان کی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی کوتاہیوں سے صرفِ نظر بھی شامل ہے اور وہ بھی اس لطافت اور نزاکت کے ساتھ کہ عزتِ نفس کا آبگینہ جراحت سے محفوظ رہے۔ اخلاق کے اس پہلو کا ایک معلم کے اندازِ تربیت سے خاص علاقہ ہے اور قرآنِ حکیم نے اس کی شہادت دی ہے کہ آپ کے اندازِ تربیت میں نرمی کا پہلو غالب تھا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کے گرد جانثاروں کا وہ مجمع نہ ہوتا جو کسی نبی کو حاصل نہ ہوا۔ صحابۂ کرام میں اسی اندازِ تربیت سے اعتماد پیدا ہوا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۲۷)

اللہ کی رحمت کے باعث آپ ان کے لئے (اپنے صحابہ پر) نرم دل ہیں۔ اگر آپ ان کے

لئے سخت گفتار اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔ آپ ان (کی کوتاہیوں) سے درگزر کریں اور ان کے لئے استغفار کریں اور باہمی معاملات میں ان سے مشاورت کریں۔

اسلامی لشکر بڑی تنظیم اور ترتیب کے ساتھ مکۂ معظمہ میں داخل ہوا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ زیریں حصے سے شہر میں داخل ہوں۔ اس علاقے میں قریش سے مڈبھیڑ کا اندیشہ تھا۔ حضرت خالد کو ہدایت کی گئی کہ ان کا دستہ کسی حالت میں کسی فرد یا جتھے کے خلاف پہل نہ کرے لیکن ان کا راستہ روکنے والوں اور مزاحمت کرنے والوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ کوہِ صفا پر پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل، ہر حکمتِ عملی اور ہر تدبیر میں کوئی نہ کوئی حکمت اور اخلاقی درس ہمارے لئے موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتِ عام کا آغاز کوہِ صفا سے کیا تھا۔ یہیں ابولہب نے آپ کے خطبہ کو سن کر کہا تھا کہ تمہارا ستیاناس۔ ہمارا دن غارت کیا اور یہیں آج کے دن اس دعوت کی نصرت کے موقع پر مسلمانوں کو جمع ہونا تھا۔ کفر اپنے ہی مرکز میں پسپا ہو گیا تھا حضرتِ زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو مکے کے بالائی حصے سے شہر میں داخل ہونا تھا۔ ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم تھا۔ مکے کا بالائی حصہ وہ ہے جہاں آج رمضان المبارک میں جدہ سے عمرے کے لئے جانے والے اپنی گاڑیاں پارک کرتے ہیں۔ اس علاقے کا نام رمضان میں ہونٹوں پر گونجتا ہے۔ کداء کداء۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم مکۂ معظمہ کے بالائی علاقے میں لہرا رہا تھا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر کے دو صحابی رستہ بھٹک کر لشکر سے الگ ہو گئے اور انہیں قریش نے شہید کر دیا۔ خندمہ کے مقام پر قریش نے سیف اللہ کا راستہ روکنا چاہا۔ جوابی کاروائی میں قریش کے بارہ آدمی مارے گئے اور قریش بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان بھاگ کھڑے ہونے والوں میں عکرمہ بھی شامل تھے۔ آج کون تھا جو اسلام کی نصرت اور تقدیرِ الٰہی کا راستہ روک سکتا۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے حجون پہنچ کر پرچم رسالت مآب نصب کیا۔ آپ کے قیام کے لئے ایک قُبہ بھی نصب کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پہنچ کر کچھ دیر قیام فرمایا اور پھر ستاروں کے جلو میں مہتاب مسجدِ حرام میں داخل ہوا۔ یہ وہ انصار و مہاجرین تھے جنہوں نے حق کی سربلندی کے لئے سب کچھ قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا اور جن کے عمل اور جذبۂ ایمان نے ان کے لئے بیت اللہ کے دروازے کھول دیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد حرام میں داخل ہونے کے بعد کعبے کا رخ کیا۔ حجر اسود آپ کے بوسے کا کئی برس سے منتظر تھا۔ آپ نے حجرِ اسود کو بوسہ دے کر خانۂ کعبہ کا طواف شروع

کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ایک کمان تھی۔ آپ اس کمان سے بیت اللہ شریف کے گرد موجود بتوں پر ضرب لگاتے جاتے اور قرآنِ حکیم کی یہ آیت آپ کے لبوں پر تھی۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا O (۲۸)

حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ یقیناً باطل تھا ہی نابود ہو جانے والا

جب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لئے مکۂ معظمہ سے مدینۂ منورہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو یہ کلماتِ قرآنی آپ کے لبوں سے دعا کی صورت میں جاری تھے۔

رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا O (۲۹)

اے میرے رب جہاں بھی لے جا اچھی طرح لے جا اور جہاں سے نکال اچھی طرح نکال اور میرے لئے اپنی جناب سے غلبہ اور امداد عطا فرما۔

یہ دعائے نصرت سورۂ بنی اسرائیل کی ۸۰ ویں آیت ہے اور باطل کے نابود ہونے کا ذکر اسی سورت کی اکیاسویں آیت میں فرمایا گیا ہے۔ گویا ایام اللہ میں ہجرت اور فتحِ مکہ کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔ ہجرت، قربانیوں اور جہد مسلسل کے یہ کٹھن اور جان لیوا دس سال تقویم الٰہی میں ایک ثانئے کے مثل ہیں۔ ہجرت اور فتحِ مکہ کا یہ متصل ذکر قرآنِ پاک کی توفیقی ترتیب کی گہرائیوں اور معنویت کی ایک مثال ہے۔ قرآن از الحمدللہ تا والناس اپنی موجودہ صورت میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کی ترتیب بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایتِ ربی کے مطابق فرمائی۔ اس کتاب العجائب والغرائب کے رموز و نکات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سامنے آتے جائیں گے۔ یہ باب قیامت تک کے لئے کھلا ہے۔

اور یہ آیتِ قرآنی بھی اس موقع پر آپ ادا کر رہے تھے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ O (۳۰)

حق آ چکا (سب پر ثابت ہو چکا)۔ باطل نہ تو پہلے کچھ کر سکا اور نہ (مستقبل میں) کر سکے گا۔

ان دونوں آیات کے اس موقع پر پڑھے جانے کی شہادت صحیح بخاری میں موجود ہے۔ (۳۱)

نبیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طواف اونٹنی پر بیٹھ کر کیا تھا اور آپ کے ہاتھ میں جو کمان تھی اس کی ضرب سے کتنے ہی بُت سرنگوں ہو گئے۔ طواف سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کی بلندی پر تشریف لے گئے اور کعبے کی طرف رخ کر کے آپ دیر تک دعا میں مصروف رہے۔ آپ کی دعا میں اللہ تعالیٰ کا شکر بھی تھا کہ اس نے آج کفر کے جتھوں کو شکست دی اور اپنے بندے کو نصرت اور غلبہ عطا فرمایا۔

آپ کی یہی دعا آج بھی سعی کا آغاز کرنے سے پہلے عمرہ اور حج کرنے والے دہراتے ہیں۔ ہمارے اخلاق کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ فتح مکہ کا دن ہمیں یاد رہے اور ہم اسی جذبۂ شکر وعبدیت کا تجربہ کرنے کی کوشش کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات کو کس طرح دعا اور عبادات سے ہم آہنگ کر دیا، اس نکتے کو جانے بغیر دعا کی طاقت اور اس کی نوعیت ہم پر آشکار نہیں ہوسکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ کلید بردارِ کعبہ کو بلا کر ان سے خانۂ کعبہ کی کنجی طلب فرمائی۔ کعبہ کی دیواروں میں معبودانِ باطل کی تصویریں تھیں اور کعبہ کے اندر ان کے بُت بھی رکھے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں میں فال کے تیر دکھائے گئے تھے۔ ان مجسموں کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان مشرکوں کو غارت کرے۔ ان عظیم المرتبت رسولوں نے کبھی تیروں کے ذریعہ فال نہیں نکالی۔ آپ نے تمام مجسموں اور بُتوں کو توڑنے اور تصویروں کو مٹا دینے کا حکم دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ کعبہ میں اللہ کی عبادت فرما کر جب کعبے سے باہر تشریف لائے تو مسجدِ حرام میں قریش صف بہ صف کھڑے تھے۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں اور دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں اور دل کتنے ہی خدشات کی آماج گاہ تھے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر اپنے بہیمانہ مظالم یاد آرہے تھے۔ ان کے وجود لرز رہے تھے کہ یومِ مکافات آپہنچا ہے، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے خطاب کرنے کے لئے زبان کھولی تو جیسے آپ کے ہونٹوں سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے بلکہ چشمۂ زمزم موج زن تھا۔ آپ نے قریش کے مظالم اور ماضی کا کوئی تذکرہ نہیں چھیڑا بلکہ انسان کی مساوات اور اخوتِ بنی آدم کا ذکر فرمایا۔ فرمایا کہ اے قریش! جاہلیت کا غرور اور انسان کُش روایات خاک میں مل گئیں۔ اب بنی آدم کی مساوات کا دور شروع ہونے جا رہا ہے اور پھر آپ نے قرآنِ حکیم کی اس آیت کی تلاوت فرمائی جو مساواتِ انسانی کا منشور ہے۔ انسانی مساوات کے جو اعلان اور چارٹر انسان نے تصنیف کئے ہیں وہ سب مل کر اس منشورِ قرآنی سے فروتر ہیں۔ رنگ و نسل، قبائل اور کنبوں کو محض شناخت قرار دیا گیا، وجہِ امتیاز نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (۳۲)

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے تخلیق فرمایا ہے اور تم کو قوموں قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ صاحبِ عزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ بیشک اللہ سب سے زیادہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

بنی آدم کی مساوات اور کردار و عمل کی برتری (تقویٰ) کے اس اعلان کے بعد کعبۂ معظم سے بُتوں کو بے دخل کرنے والے اور جہانِ نو کے معیارِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے سوال کیا کہ اے قریش والو! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ آج کیا سلوک کرنے والا ہوں۔ یہ محض ایک خطیبانہ اندازِ تکلم ہی نہیں تھا بلکہ ایسا سوال تھا کہ قریش نبیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے بیس اکیس برسوں کے رویے اور برتاؤ کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ظلم و ستم کے یہ ماہ و سال ایک آن میں نظر کے سامنے سے گزر گئے، اور فجل انداز اور آواز میں قریش کا یہ جواب حرمِ پاک کی فضاؤں نے سنا کہ آپ کریم برادر زادے ہیں، اور آپ کی ذات بھی کریم ہے اور کریم ہی کرم کے انداز جانتا ہے۔ پھر حرم میں سناٹا چھا گیا اور اس سناٹے اور خاموشی میں دلوں کے دھڑکنے کی آوازیں بھی جیسے سنائی دے رہی تھیں اور اس خاموشی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز نے توڑا۔ میں آج تم سے وہی کہنے جا رہا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے صدیوں پہلے اپنے بھائیوں سے کہا تھا **لا تثریب علیکم الیوم** آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اللہ کی شانِ کرم تاریخ میں ایک بار پھر نئے انداز سے اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا جواب جو قرآنِ مجید کی اس آیت میں آ گیا ہے۔ عفو و درگزر کی صدیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور پھر فتح مکہ کے پس منظر میں غور کیجئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتحِ عظیم کا یہ اعلان ہے **لا تثریب علیکم الیوم**۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کی بارش میں قریش نہا رہے تھے، اور اخلاق کے عظیم سلسلے کا ہر گوشہ تکمیل کا ہر سامان اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ قریش سے خطاب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں بیٹھ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو کتنے عزیز تھے، یہ بات تحریر میں کیسے اظہار پا سکتی تھی، اس کے بارے میں سوچا ہی جا سکتا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کے شفیق اور ''لاڈلے'' چچا تھے۔ مختلف روایتوں کے مطابق دونوں نے آپؐ سے خانۂ کعبہ کی کلید برداری کے اعزاز کے حصول کی درخواست کی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ عثمان بن طلحہ کہاں ہیں۔ وہ خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے کلیدِ کعبہ ان کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ چابی تمہارے پاس مسلمانوں کی امانت ہے۔ آج کا دن نیکی اور وفاداری کا دن ہے۔ یہ چابی ہمیشہ کے لئے تمہارے (خاندان کے) سپرد کی جاتی ہے۔ یہ ایک امانت ہے جو تمہارے سپرد کی جاتی ہے اور جو اسے تم سے چھینے گا وہ ظالم ہوگا۔

فتح مکہ کے دن نو بڑے مجرموں کے قتل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا تھا۔ ان میں سے چند مکہ معظمہ سے فرار ہو گئے اور چند کی سفارش صحابۂ کرام نے کر دی جو آپ نے منظور فرمائی۔ جو بڑے مجرم سزا سے بچ گئے، ان میں عکرمہ بن ابی جہل اور کعب بن زبیر بھی شامل تھے۔ عکرمہ یمن بھاگ

گئے تھے۔ان کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کے لئے امان طلب کی اور ایمان لانے کے بعد عکرمہ کی زندگی کا ہر لمحہ اور ان کی موت بھی ان کے ایمان اور صداقت کی شاہد ہے۔ کعب بن زبیر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوکر نعتیہ قصیدہ لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا قصیدہ سماعت فرما کر انہیں ایک چادر عنایت فرمائی اور یہی قصیدہ قصیدۂ بردہ (اول) کے نام سے مشہور ہے۔

فتح مکہ کے دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان فرمانے کے بعد آپ نے مکۂ معظمہ کی حُرمت کا اعلان فرمایا۔ وہ حرمت جو قیامت تک قائم رہے گی، اس حرمت کے سارے ہی پہلو اخلاق سے متعلق ہیں۔ مکہ کی حرمت انسانوں اور جانوروں ہی کے لئے نہیں بلکہ نباتات کے لئے بھی اپنے دامن میں امن رکھتی ہے۔ اہلِ ایمان کے لئے حدودِ مکہ میں کسی کا خون بہانہ حرام ہے، حدودِ مکہ میں درخت کے کاٹنے کا حکم نہیں، انتہا تو یہ ہے کہ اذخر کے علاوہ کوئی دوسری گھاس بھی کاٹی نہیں جاسکتی۔ اذخر کے کاٹنے کی اجازت اس بنا پر دی گئی ہے کہ یہ دوا یا دوا کے جز کے طور پر استعمال کی جاتی تھی اور لوہاروں کو اپنی پیشہ وارانہ ضرورت کے استعمال کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے اجازت یا منع کرنے کا یہ سبب واضح ہوجاتا ہے کہ جس چیز میں انسانوں کا نفع ہو وہ جائز ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ حقیقت بھی بیان فرمادی ہے کہ جس چیز میں منفعت ہو وہ زمین میں قائم رہتی ہے۔ اسلام کے نظامِ اخلاق میں ان محرکات اور اسباب کو قوت پہنچانا بھی شامل ہے جو انسان کو اعمالِ حسنہ پر ابھاریں اور نیکی کی فضا قائم کریں۔

فتح مکہ کے ساتھ ہی اسلام کے قانون صرف مدینۂ منورہ کی اسلامی ریاست تک محدود نہیں رہے بلکہ مکۂ معظمہ تک اسلامی ریاست کی حدود وسیع ہوگئیں۔ اسی موقع پر بنومخزوم کی ایک بااثر خاتون فاطمہ مخزومیہ پر چوری کا الزام ثابت ہوگیا اور اس پر چوری کی حد (قطعِ ید) جاری کردی گئی۔ یہ بات عرب معاشرے کے لئے عجیب تھی کہ امیر اور غریب دونوں پر قانون یکساں طور پر جاری کیا جائے۔ حضرت اسامہ نے فاطمہ مخزومیہ کی سفارش کی کہ اسے معاف کردیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری سے جواب دیا کہ پرانی قوموں کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ غریبوں کو جرائم کی سزائیں دی جاتیں اور سرمایہ داروں اور بااثر افراد پر قانون کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس پر بھی حد جاری کی جاتی۔ اس انتہائی مثال سے قانون کے بارے میں ہر فرد کی برابری اور اس کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ اسی واقعہ کی بنا پر ناجائز سفارش سے بھی منع

کر دیا گیا۔ جہاں اچھی سفارش کا اجر سفارش کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے وہاں بری سفارش کا عذاب بھی سفارش کرنے والے پر پڑتا ہے اور اسے قبول کرنے والے پر بھی۔

فتح مکہ سارے مہاجرین اور انصار کے لئے عظیم خوشی کا عظیم موقع تھا۔ لات وہبل اور سارے معبودانِ باطل کعبہ سے بے دخل کر دیئے گئے اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس شہر میں حق کی جلالت وعظمت کا نشان بن کر واپس آئے جہاں سے آپ کو ہجرت کرنی پڑی تھی، لیکن اس موقع پر انصار کے دل ایک اندیشے سے بوجھل تھے اور انہوں نے چپکے چپکے ایک دوسرے سے اس اندیشے پر گفتگو بھی کی۔ اندیشہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب اپنے شہر میں ہیں اور شاید آپ مدینے واپس نہیں جائیں۔ یوں ان کا شہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی برکت سے محروم ہو جائے گا، مدینے کی فضائیں آپ کے وجود کی خوشبو کے بغیر کیسی بے کیف ہو جائیں گی اور مسجدِ نبوی کے محراب ومنبر آپ ﷺ کے فراق میں گریہ وکناں رہیں گے۔ جب رحمتِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار کے اس اندیشے کا علم ہوا تو آپ نے ان سے یہ فرمایا کہ اے گروہ انصار! میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہے۔ آپ کے اس اعلان سے انصار کے چہروں پر ان کے دلی جذباتِ تشکر واطمینان رنگِ مسرت بن کر ہویدا ہو گئے۔ آپ کا یہ فیصلہ بھی آپ کے اخلاقِ کریمانہ کا ایک جز ہے۔ یوں آپ نے انصار کی قربانیوں کا اعتراف کیا اور اپنی اور مہاجرین کی ''میزبانی'' کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ یہ شکر مومن کی شناخت اور اس کے کردار کا حصہ ہے۔ مومن ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور انسانوں کا شکریہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ۔ (۳۳) جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اپنے رب کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

شکر گزاری کے جذبات، انسان کی شرافت کی اٹل دلیل ہیں۔ جو اس کو کوئی نفع پہنچائے شکر گزاری اس کے عملِ منفعت رسانی کا ایک اعتراف ہے۔ ہم کو ہمارے رب نے زندگی اور صحت عطا فرمائی، ہمیں ایمان کی دولت سے نوازا، ہمیں اچھا رفیق، اچھے بچے عطا فرمائے، رزقِ جلیل دیا، دینِ حق کی خدمت کی توفیق ارزانی کی، زندگی کے ہنگامے ہم پر سہل فرمائے۔ غرض زندگی کی ایک ایک ساعت اللہ کی نعمتوں سے عبارت ہے اور ہر نعمت کا شکر ہم پر واجب ہے، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے شکر سے بے نیاز ہے اور اس کی بہت سی نعمتیں مومن اور کافر دونوں کے لئے ہیں۔

وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝ (۳۴)

جو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے نفس اور اپنے نفع کے لئے شکر گزاری کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو میرا رب غنی اور کریم (اور ہر شکر گزاری سے بے نیاز) ہے۔

اللہ تعالیٰ بندوں کی شکر گزاری سے بے نیاز ہے مگر اسے بندوں کی شکر گزاری کی ادا پسند ہے، کیونکہ شکر گزاری اپنے بندے ہونے کا اعتراف ہے اور اسی لئے اس نے فرمایا کہ **نجزی من شکر** (۳۵) جو شکر ادا کرتا ہے ہم اسے جزا سے نوازتے ہیں۔ شکر اخلاق اور زندگی کا ایک وسیع باب اور شکر کے مواقع اور شکر کی اہمیت پر کلام اللہ کی آیات گواہ ہیں۔

غزوۂ حنین

مکۂ معظّمہ میں قریش کی شکست اور اسلام کی فتح اتنی اچانک تھی کہ قبائل عرب حیران رہ گئے۔ مدینے سے مکے تک ایک فوجِ جرار کے سفر سے رب العزت نے کفار کو غافل رکھا اور پھر کسی معرکے کے بغیر مکہ معظّمہ پر اسلام کا تسلط بڑی ان ہونی سی بات تھی۔ بیشتر قبائلِ عرب نے تقدیرِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا اور انہوں نے اسلام کی بالا دستی کو بہر حال قبول کر لیا لیکن ہوازن اور ثقیف کے قبائل اپنے کفر، اپنی عصبیت اور اسلام دشمنی میں شدید تھے اور انہوں نے ایک ''فیصلہ کن'' معرکے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کر لیا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ فیصلہ تو ہو گیا ہے۔ ہوازن، ثقیف، مُضر جُشم، بنی سعد اور بنو بلال کے جنگ آزما مالک بن عوف کی قیادت میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی عورتوں، بچوں اور مال مویشی کو اپنے ساتھ لیا۔ اس عمل کا مفہوم یہ تھا کہ اب کہیں لوٹ کر نہیں جانا ہے۔ فتح یا موت۔

یہ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے مکے کی طرف بڑھے اور وادئ اوطاس میں خیمہ زن ہوئے جو حنین کے قریب ہے۔ اس فوج کشی کی اطلاع پا کر دشمن سے مقابلہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بارہ ہزار کی فوج کے ساتھ ۶ شوال ۸ ھ کو مکۂ معظّمہ سے روانہ ہوئے۔ اپنی تعداد پر صحابۂ کرام کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اتنے بڑے لشکر کی تاب ہوازن وثقیف کہاں لا سکتے ہیں؟ اپنی تعداد اور طاقت پر یہ غرور اللہ جل جلالہٗ کو پسند نہ آیا۔ اللہ کی فوج وقتی طور پر اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی تھی کہ فتح و شکست کا تعلق تعداد پر نہیں ہے بلکہ اپنے مقصد کی حقانیت اور اللہ کی نصرت سے ہے۔ رب العزت نے انہیں بے سروسامانی کے عالم میں بدر واحزاب وخیبر میں فتح یاب کیا تھا۔ اس غرور کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وادئ حنین کے درّوں میں چھپے ہوئے ہوازن وثقیف کے تیر اندازوں نے ان پر تیروں کی بارش کی اور پھر وہ ان پر ٹوٹ پڑے تو ان کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر معمولی شجاعت کا ثبوت دیا۔ آپ کا یہ استقلال غزوۂ اُحد کی پامردی سے کہیں بڑھ کر تھا۔ تیر کی بارش میں آپ کے ہونٹوں پر یہ کلمات تھے۔

انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب

آپ اپنے خچر پر سوار تھے اور اس افراتفری کے عالم میں بھی مقابلے کے لئے آپ کا رخ کفار کے لشکریوں کی طرف تھا۔ آپ کے گرد چند صحابہ رہ گئے تھے۔ ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے جنہوں نے سرکار آسماں مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر صحابہ کو آواز دینا شروع کیا۔ اے اصحابِ بیعتِ رضواں، اے بدر واحد کے جاں نثار و درخت کے نیچے اپنی جان کی قیمت پر بیعت کرنے والو۔ کہاں ہو، ادھر آؤ، اللہ کے رسول کی طرف آؤ۔ حضرت عباس کی پاٹ دار آواز وادی میں گونج رہی تھی جسے سن کر صحابہ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جانیں قربان کرنے کا جذبہ موج زن ہوگیا۔ وہ لوٹ پڑے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد آہنی حصار بن گئے، اور فریقین میں شدید جنگ شروع ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری روداد قرآنِ حکیم کی دو آیات میں بیان کردی ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ O ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَO (۳۶)

بیشک اللہ نے بہت سے میدانوں (اور علاقوں) میں تمہیں فتح دی ہے اور حنین کے دن جب تمہیں اپنی کثرت پر غرور ہوگیا تھا، لیکن تمہیں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا، اور زمین اپنی کشادگی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی تھی اور تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے تھے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر سکینت اور تسلی نازل فرمائی اور وہ لشکر اُتارے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے اور کفر کرنے والوں کو پورا عذاب اور سزا دی۔ اور یہی عذاب ان کافروں کی جزا تھا۔

غزوۂ حنین کی ساری تفصیلات اس اجمال کے دامن میں چھپی ہوئی ہیں۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ حنین میں کئی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ مسلمانوں پر سکینت کا نزول، فرشتوں کی فوج کا مدد کے لئے آنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مٹھی خاک لے کر کفار کی طرف پھینکنا اور فرمانا شاھت الوجوہ اور دشمن کے ہر سپاہی کی آنکھ کا اس مٹی سے متاثر ہونا۔

فتح مکہ، غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے کئی گوشے اس طرح ابھر کر سامنے آئے کہ آج تک وہ واقعات چشمِ ایام کو روشن کر رہے ہیں۔ آپ کی شجاعت، عفو و درگزر کا ذکر آچکا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے اصحاب کے ساتھ آپ کے تعلق اور شفقت کی طرف بھی اشارہ کیا

جا چکا ہے، اور کس طرح آپ نے انصار کی میزبانی کا شکریہ اپنی قائم رہنے والی رفاقت اور مستقل قیامِ مدینہ کے ذریعے ادا فرمایا۔ جود وسخا اور عطا و کرم سے آپ کی فطرت کا تار و پود اللہ رب العزت نے بُنا تھا اور خاص طور پر ہر رمضان میں آپ کی سخاوت کا ظہور اسی طرح ہوتا جیسے نرم ولطیف ہوا مسلسل چل رہی ہو۔ غزوۂ حنین کے بعد بہت زیادہ مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ چھ ہزار قیدی، پچیس ہزار اونٹ، بکریاں تقریباً پچاس ہزار، ڈیڑھ پونے دو لاکھ درہم، سونے کی بڑی مقدار۔ اس سارے مالِ غنیمت کی تقسیم میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے عجلت نہیں فرمائی۔ آپ کی شفقت ہوازن والوں کے تائب ہونے کی منتظر تھی کہ اگر وہ تائب ہو کر مسلمان ہو جائیں تو ان کا سارا مال و اسباب انہیں واپس کر دیا جائے۔ اگرچہ مسلمانوں کو بھی اس مال کی ضرورت تھی لیکن حضور کا قلبِ دردآشنا خوب جانتا تھا کہ مغلوبوں کو اپنے مال ومتاع کا کتنا غم ہوگا۔ دوسری طرف فتحِ مکہ کے بعد اسلام قبول کرنے والے اس مالِ غنیمت کو دیکھ رہے تھے۔ مختلف قبائل اور قریش کے سرداروں کے دلوں میں اس مالِ غنیمت سے حصہ پانے کی آرزو ان کے چہروں سے صورتِ سوال نظر آ رہی تھی۔ پھر نومسلموں کی تالیفِ قلب کا اصول قرآن میں بیان کیا جا چکا تھا۔ انسانوں کا خالق فطرتِ انسانی کے ہر رجحان اور ہر کمزوری کو خوب جانتا ہے اسی لئے اس نے مولفۃ القلوب کو دولتِ دنیا کے ذریعے دینِ حق پر جم جانے کی طرف اپنے رسول کو متوجہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زر و مال سے یہ ''رشتہ'' تھا کہ گھر میں اگر سوال نے یا چاندی کا کوئی ''ٹکڑا'' رہ جاتا تو آپ ﷺ کو اس وقت تک نیند نہ آتی جب تک اسے صدقہ نہ کر دیا جاتا۔ اس مالِ غنیمت کو آپ نے مدینے کی ریاست کے لئے بھی بچا کر رکھنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اسے مولفۃ القلوب اور مجاہدین میں تقسیم کر دیا اور اس طرح کہ ان نومسلموں کو پوری طرح اندازہ ہو گیا کہ یہ دنیا اپنی تمام دولت کے ساتھ اللہ کے رسول کی نظر میں کتنی حقیر ہے اور انسانوں کی خوشی آپ کو کس درجے عزیز ہے۔ آپ نے ابوسفیان بن حرب کو کم وبیش چھ سیر چاندی اور سو اونٹ مرحمت فرمائے۔ ابھی اسلام کی اقدار ان کے دل میں راسخ نہیں ہوئی تھیں اور دنیا کی طمع نے ان کے دل میں فقر کے لئے جگہ نہیں پیدا کی تھی۔ اپنا حصہ پا کر انہوں نے کہا کہ ''اور میرے بیٹے یزید کو آپ نے کچھ نہیں دیا''۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یزید کو بھی اتنا ہی عطا کیا۔ اس بخشش کو دیکھ کر خواہشِ دنیا اور بڑھ گئی۔ پھر سوال کیا ''اور میرا بیٹا معاویہ''۔ جودِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ کو بھی اسی قدر بخش دیا۔ ایک خاندان کو کم وبیش اٹھارہ سیر چاندی اور تین سو اونٹ مالِ غنیمت سے مل گئے۔ اس عطا اور سخاوت کو دیکھ کر بدوؤں نے آپ کو گھیر لیا اور آپ سب کو کچھ نہ کچھ دیتے چلے گئے۔ لوگوں کی اس یلغار میں آپ ایک درخت سے جا لگے اور آپ کی چادر درخت کی شاخوں میں پھنس گئی۔ آپ نے فرمایا

کہ میری چادر تو مجھے دے دو۔ بخشش کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ مالِ فے میں سے بھی کچھ نہ بچا۔

نومسلموں اور قریش میں مالِ غنیمت کی اس تقسیم کی حکمت انصارِ مدینہ اس وقت نہیں سمجھ سکے۔ شیطان انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے اور موقع پاتے ہی ایمان پر حملہ کرتا ہے۔ انصارِ مدینہ میں اپنی اس مالی محرومی پر چہ مگوئیاں شروع ہوگئیں۔ انصار میں سے کسی آدمی نے یہاں تک کہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی طرف جھک گئے ہیں اور ہمیں بھول گئے۔

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ذاتی یا گروہی مفادات کسی بھی جماعت کے افراد کو اپنی وحدت اور اپنے مقاصد سے وقتی طور پر دور کر سکتے ہیں اسی لئے جماعت کی مختلف وحدتوں میں اتنا ربط لازم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اپنے خیالات کا تبادلہ کر سکیں اور آپس ہی میں گفتگو کر کے اختلافات کو نہ بڑھائیں اور اپنے آزمائے ہوئے رہبر پر یقین رکھیں اور یہاں تو معاملہ اللہ کے رسول کا تھا جس کے کسی عمل میں بھی کسی غرض یا کسی کی جانب داری کا شائبہ تک ممکن نہیں ہے۔ جب انصار کی یہ باتیں حضرت سعد بن عبادہ کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ انصار کو اپنے خیمے میں جمع کر لو اور جب انصار جمع ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مجمع میں تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے گروہِ انصار! تمہاری خفگی اور مالِ غنیمت کے سلسلے میں تمہاری باتیں اور بدگمانیاں مجھ تک پہنچی ہیں۔ کیا تم بھول گئے کہ جب میں تم میں آیا تھا تو تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ میرے وسیلے اور اسلام کے ذریعے اللہ جل جلالہٗ نے تمہارے دل جوڑ دیئے، جب میں تمہارے درمیان آیا تو تم حق سے دور اور گمراہ تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت عطا کی، میں جب تمہارے درمیان آیا تو تم مفلس تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں غنی بنا دیا۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بول رہے تھے اور مجمع پر مکمل سکوت طاری تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ کلام کو منقطع کرتے ہوئے انصار سے اچانک کہا کہ تم کچھ تو جواب دو، خاموش کیوں ہو؟ انصار نے کہا کہ اے اللہ کے رسول کیا جواب دیں۔ سب اللہ اور رسول کا کرم ہے، فضل ہے۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر تم یہ کہو اے محمد! جب تیری قوم نے تیری تکذیب کی اور تو ہمارے پاس آیا تو ہم نے تیری تصدیق کی، جب تجھے وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تو ہم نے تجھے ٹھکانا دیا، جب تو بے یار و مددگار تھا تو ہم تیرے مددگار بنے۔ کہو، کہو، یا معشر الانصار کہو۔ اور میں تمہاری ہر بات پر کہوں گا کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ اے اللہ کی رضا کے لئے اللہ کے رسول کے مددگار بننے والو! اب تم اس دنیا کی دولت کے لئے مجھ سے ناراض ہوگئے جسے میں نے تمہارے ایمان سے کم تر جان کر نئے ایمان لانے والوں کے دل

جوڑے۔ اے انصار! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو گے کہ دوسرے سونا، چاندی، اونٹ بکریاں لے جائیں اور تم اللہ کے رسول کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں نے ہجرت ضرور کی ہے مگر میں اپنے آپ کو تم میں شمار کرتا ہوں۔ اگر سارے لوگ ایک راہ پر چلیں اور انصار دوسری راہ پر تو میں انصار کے راستے پر چلوں گا۔ اے اللہ! تو انصار پر رحم فرما، انصار کے بیٹوں پر رحم فرما، اور بیٹوں کے بیٹوں پر رحم فرما۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب سن کر انصار اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ ان کی سسکیوں اور آہ و بکا کی آوازیں حضرت سعد بن عبادہ کے خیمے میں گونج پڑیں۔ انصار کی ڈاڑھیاں ان کے آنسوؤں سے تر ہو گئیں، دل کا غبار چھٹ گیا، مال و دولت کی خواہش دل سے رخصت ہوئی اور اللہ اور رسول کی محبت نے دلوں کو بھر دیا۔ انصار چلا اُٹھے کہ ہم خوش بخت ہیں کہ اللہ کا رسول ہمارے حصے میں آیا ہے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی احادیث میں انصار کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اور ان سے محبت کے ثمرات کا ذکر ملتا ہے۔ حُب الانصار کتبِ احادیث کا مستقل باب ہے۔ بخاری شریف میں حضرت براءؓ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت موجود ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ صرف مومن ہی انصار سے محبت رکھ سکتا ہے اور صرف منافق ہی ان سے دشمنی رکھ سکتا ہے۔ پس جو شخص ان سے محبت کرے گا اس سے اللہ تعالیٰ محبت کرے گا اور جو شخص ان سے بغض رکھے گا اس سے اللہ تعالیٰ بغض رکھے گا۔ (۳۱) ایک مرتبہ جب انصار کی عورتیں اور بچے کسی شادی سے واپس آ رہے تھے تو ان کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور آپ نے تین مرتبہ فرمایا انتم احب الناس الیّ تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو۔

ہوازن کا وفد خدمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں

مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد ہوازن کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ اس وفد میں چودہ افراد تھے۔ اب یہ لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ اپنی شکست نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہ ہوتے اور آپ کے ساتھ اللہ کی نصرت نہ ہوتی تو انہیں غلبہ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اپنی شکست کے بعد یہ لوگ اس فیصلہ پر کئی دنوں کے بعد پہنچے۔ اس وفد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی چچا بھی شامل تھے۔ انہیں دیکھ کر نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ کو اپنے بچپن کے وہ دن یاد آ گئے، جو آپ نے حضرت حلیمہ سعدیہ کے قبیلے میں گزارے تھے۔ اور پھر رضاعی چچا حضرت ابو یرقان نے اپنی معروضات پیش کرتے ہوئے کہا کہ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی وہ خالائیں، آپ کی وہ پھوپھیاں اور آپ کی وہ دادیاں جو آپ کو کھلایا کرتی تھیں اور وہ آپ کو دیکھ کر خوش ہوتی تھیں آج قیدیوں میں شامل

ہیں۔ آپ بچپن میں بھی حلیم، کریم اور صاحبِ اخلاق تھے اور نبوت کے بعد تو آپ کے اخلاقِ و کردار کریمانہ کے کرم کی کوئی حد نہیں رہی۔ آپ احسان فرما کر اپنے قیدیوں کو آزاد فرما دیں۔ ہم تاخیر سے آئے ہیں اور مالِ غنیمت تقسیم ہو چکا مگر ہمیں اپنے مال کی واپسی سے زیادہ اپنے قیدیوں کی رہائی عزیز ہے، ہم پر احسان فرمایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدوں کے سامنے ساری صورتِ حال رکھ دی اور ان سے کہا کہ وہ اپنی خوشی سے قیدیوں کو آزاد کر دیں گے تو ان کا رب انہیں اجر عطا فرمائے گا۔ انصار تو ایک بڑے جذباتی بحران سے گزر چکے تھے اور مہاجرین تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سارے مرحلے طے کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بیک آواز کہا کہ ہمارا جو کچھ ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔ ہم اپنے قیدی اللہ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش نودی کے لئے آزاد کرتے ہیں۔ بنو تمیم، بنو سلیم اور بعض قبائل کے سرداروں نے قیدیوں کو آزاد کرنے پر رضامندی ظاہر نہیں کی لیکن بنو سلیم نے اپنے سردار کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے قیدیوں کو رضائے الٰہی کے لئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل میں آزاد کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بیشتر صحابہ کرام کے دلوں میں کتنی راسخ تھی اور آپ نے آزادئ رائے کی روایت کس درجہ عام کر دی تھی۔ ان امور میں باہمی مشاورت پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں تھا اور صحابۂ کرام اکثر اخلاقی پہلوؤں کو اپنے فیصلوں میں اہمیت دیتے تھے۔ یہ وہ اخلاقی فضا تھی جس سے آج کے ''جمہوری'' معاشرے محروم ہیں اور اپنے مفادات سے بلند ہو کر فیصلے نہیں کرتے۔

حوالہ جات

۱۔ الفتح:۲۹
۲۔ النمل:۳۴
۳۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ج۴، ص۷۰
۴۔ آل عمران:۱۴۷
۵۔ الانفال:۸
۶۔ بخاری، کتاب المغازی۔ باب۵۱۲
۷۔ بخاری، کتاب المغازی۔ باب۵۱۲
۸۔ ایضاً
۹۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی

۱۰۔ الفتح:۲۸
۱۱۔ آل عمران:۱۴
۱۲۔ آل عمران:۱۸۵
۱۳۔ النساء:۷۷
۱۴۔ البقرۃ:۲۶۱،۲۶۲
۱۵۔ التوبہ:۹۲
۱۶۔ توبہ:۹۳
۱۷۔ التوبہ:۸۱
۱۸۔ التوبہ:۱۷۳
۱۹۔ التوبہ:۱۱۸
۲۰۔ النساء:۸۷
۲۱۔ التوبہ:۱۰۷
۲۲۔ المائدہ:۱
۲۳۔ البقرہ:۱۷۷
۲۴۔ الفتح:۱۰
۲۵۔ یوسف:۹۱
۲۶۔ یوسف:۹۲
۲۷۔ آل عمران:۱۵۹
۲۸۔ بنی اسرائیل:۸۱
۲۹۔ بنی اسرائیل:۸۰
۳۰۔ سبا:۴۹
۳۱۔ بخاری، کتاب الجہاد، باب ازالۃ الاصنام من حول الکعبہ
۳۲۔ الحجرات:۱۳
۳۳۔ ترمذی، السنن، دار الفکر، بیروت: ج۳، ص۳۸۳، رقم ۱۹۶۲
۳۴۔ النمل:۴۰
۳۵۔ القمر:۳۵
۳۶۔ التوبہ:۲۵،۲۶
۳۷۔ بخاری، حدیث نمبر ۹۶۹